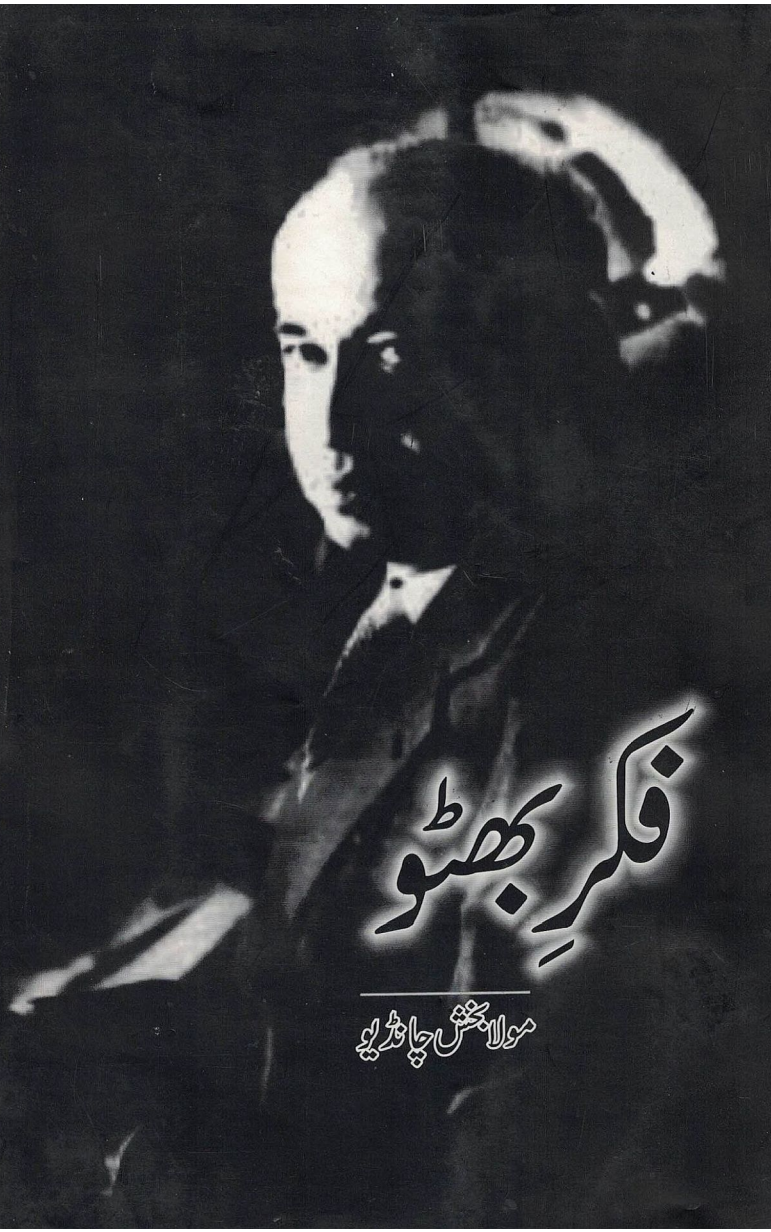

فکرِ بھٹو

مولا بخش چانڈیو

فکرِ بھٹو

لیکچرز کا مجموعہ

مولا بخش چانڈیو

مرزا اکیڈمی ، بدین

جملہ حقوق محفوظ

فکرِ بھٹو

لیکچرز کا مجموعہ

مصنف: مولا بخش چانڈیو

اشاعت: اپریل 2007ء

ناشر: ڈاکٹر ذوالفقار مرزا

چیئرمین مرزا اکیڈمی، بدین

طابع: سندھو پبلیکیشنز، حیدرآباد

موبائل: 0301-3565767

تعداد: ایک ہزار

قیمت: -/130 روپیہ

انتساب

قاعدِ عوام

ذوالفقار علی بھٹو شہید کی فکر کے نام

جس نے کروڑوں لوگوں کو

جینے کا سلیقہ اور جدوجہد کا حوصلہ دیا

بسم اللہ

شہید ذوالفقار علی بھٹو میرے قائد تھے اور آج بھی ہیں۔ کل وہ خود ہمارے قافلہ کی قیادت کر رہے تھے آج ان کی فکر ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ شہید بھٹو، قائداعظم کے بعد پاکستان کے واحد سیاسی رہنماء ہیں جنھیں عوام کی بے مثال اور والہانہ حمایت حاصل تھی۔ قائداعظم کے بعد بھٹو صاحب کے متعلق ہی سب سے زیادہ لکھا اور بولا گیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قائداعظم بانی پاکستان تھے اس لیے ان کی ہر حوالے سے ثنا ہی ہوتی رہی ہے، جب کہ بھٹو صاحب کے اپنے سیاسی نظریات تھے اور ان کی اپنی ایک سیاسی پارٹی بھی تھی۔ پاکستان کو دنیا کے خوشحال جمہوری ملکوں کی صف میں لانے کے لیے ان کے پاس اپنا پروگرام بھی تھا، وہ عوامی قوت کے بل بوتے پر ایک انقلابی تبدیلی لانے کے خواہاں تھے۔ سب سے بڑھ کر وہ ایک حکمران بھی تھے ایسے ملک کے جہاں جمہوریت نے ابھی جنم ہی لیا تھا وہ بین الاقوامی مدبر بھی تھے، عالمی سطح پر سامراجی قوتوں کے خلاف سرگرم ہونے کی وجہ سے ان کے بین الاقوامی مخالف بھی تھے ایسے میں ان کی حمایت میں لکھنے اور بولنے سے زیادہ ان کے خلاف لکھا گیا ہے، بھٹو صاحب پر بعض غیر ملکی دانشوروں نے بھی لکھا ہے لیکن ان پر لکھنے سے زیادہ ان سے عوامی محبت کا مظاہرہ ہوتا رہا ہے۔

ملکی سطح پر ان کے خلاف بولنے اور لکھنے والوں کی ایک لمبی قطار نظر آتی ہے۔ ان پر تنقید کرنے والوں کا شمار پاکستان کے انتہائی مراعات یافتہ اور معروف افراد میں ہوتا ہے۔ ملک کے ممتاز قانون دان اور دانشور، ایس، ایم ظفر صاحب ہوں کہ ایئر مارشل اصغر خان صاحب، خود کو خالص فوجی اور غیر جانبدار جنرل ثابت کرنے والے جنرل جہانداد خان ہوں کہ جنرل ضیاء کے دست راست، کے ایم عارف صاحب۔ ہر حکومت میں ممتاز مقام اور منصب پر رہنے والے سول بیوروکریٹ ہوں کہ ہر جمہوری رہنماء کے خلاف سازشوں کے جال بننے والے پیشہ ور لکھاری، سب کے سب الگ ہوتے ہوئے بھی بھٹو صاحب کے معاملے میں ایک نظر آتے ہیں۔ سب کے سب الگ الگ جملے اور الفاظ بھٹو صاحب کے تذکرے پر آتے ہی تلخ ہو جاتے ہیں سب

www.bhutto.org

اکائیاں ایک مقصد میں یکجا ہو جاتی ہیں۔ میں بھٹو صاحب کے مخالفین اور ناقدین کی تحریروں اور تجزیوں پر کوئی تفصیلی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا لیکن ان کا مختصر تبصرہ بے محل بھی نہیں سمجھتا۔

پیشہ ور لکھاریوں کی الگ بات ہے کہ دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام، جس کا جہاں اور جیسا رزق لکھا ہے اسے وہیں اور ویسا ہی رزق ملتا ہے۔ بھٹو صاحب کے نام سے بھی کئی افراد روزگار کماتے ہیں، یہ بھٹو کا کمال ہے ان کی تعریف کر کے بھی لوگ عزتیں اور محبت اور اس پر الزام تراشی کر کے بھی کچھ لوگ اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں۔ جنرل ضیاء کے ساتھیوں کی باتیں بھی زیادہ حیرت انگیز نہیں کہ تاریخ میں ایسے کئی صاحب اختیار اور شریک کار اپنے گذشتہ دور اور اعمالوں سے لاتعلقی کے اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔ جنرل ضیاء کے بھیانک دور میں جو ستم ڈھائے گئے ہیں، جو کربناک یادیں چھوڑی ہیں اور ملکی تاریخ میں جو سیاہ باب تحریر کئے ہیں ان سے لاتعلقی کرنا تو کوئی انوکھی بات نہیں۔

شاید ہی کہیں اور کبھی اتنے سارے ہمعصر اعلیٰ افسروں کی یادیں تحریر ہوئی ہوں جتنی حالیہ برسوں میں ہمارے پاکستان میں شائع ہوئی ہیں۔ یقینی طور پر ان کتابوں کے صاحبوں کے کارنامے بھی ہونگے جن کو یاد دلانے کے لیے کچھ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ایک بات جو ہر صاحب شعور قاری کو محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ ان سب کتابوں اور تحریروں میں شہید بھٹو کو مجرم ثابت کرتے ہوئے مصنفین نے اپنے اپنے انداز سے شہید بھٹو کے عدالتی قتل سے خود لاتعلقی اور بے خبری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سچائی کی دائمی فتح کی دلیل ہے کہ ظلم اپنے خلاف ثبوت خود ہی فراہم کرتا ہے۔ قاتل اپنی کارروائی کی گواہی خود ہی چھوڑ جاتا ہے، ایسا نہ ہوتا تو آج تک کسی قاتل کی نشاندہی نہ ہوتی عدالتوں اور تاریخ کے کٹہرے ویران نظر آتے ان کتابوں میں بھی ایسا ہی ہے کئی تردیدیں کرتے ہوئے کئی اعترافات بھی ہو گئے ہیں ویسے بھی سرکاری سرپرستی اور کثیر سرمایہ فراہم کر کے کتابیں شائع کرنے سے عظمتیں حاصل ہوتیں تو آج تاریخ میں ایک بھی حق پرست کا نام نہیں ہوتا، حضرت عیسیٰ کو صلیب میں سوار کرنے کے بعد ان کا مقدس جسم کئی دن عام زیارت گاہ بنا رہا لیکن، ہزاروں عقیدت مندوں میں سے کسی کو بھی آزادی سے رونے کی

www.bhutto.org

اجازت بھی نہ تھی، حضرت حسینؓ کے نام اور نشانوں کو مٹانے کی لاکھ کوششیں کی گئیں وارثوں کو اپنے پیاروں کو رونے کی اجازت نہیں دی گئی لیکن آج اربوں افراد عیسیٰؑ کے نام پر پھول نچھاور کر رہے ہیں صلیبوں کو اپنے گلے میں سجائے ہوئے ہیں، آج کروڑوں انسان حضرت حسینؓ کی چوکھٹ پر سلامی دیتے ہوئے خود کو خوش نصیب تصور کرتے ہیں ان کی آنکھیں حضرت حسینؓ کے لیے اشک باری میں خود کی زندگی تصور کر رہی ہیں۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو کی عدالتی انصاف کے نام پر قتل کرنے کے بعد تمام انسانی قانونی اصول بالائے طاق رکھ کر رات کے اندھیرے میں گڑھی خدا بخش لایا گیا صرف گھر والوں کو اطلاع دی گئی کسی کو قبرستان اور میت کے قریب آنے کی اجازت نہیں دی گئی خاندان نے آخری دیدار کیا اور چند لوگوں کو گھیرے میں لا کر جنازہ نماز ادا کی گئی لیکن آج برسوں بعد جنرل کے ایم عارف کی کتاب میں شہید بھٹو کے جنازہ نماز کی تصویر نے کئی کہانیوں کی اصلیت ظاہر کر دی ہے کتنی جلدی تھی ظالموں کو انصاف کا جنازہ دفنانے کی، کتنے بے چین تھے اپنا جرم چھپانے کے لیے کہ پاکستان کے محسن کے جنازے کے لیے ان کے قبر کے مطابق چارپائی کا انتظام بھی نہیں ہونے دیا۔ کئی دن قبر پر پہرا لگا دیا گیا، فاتحہ خوانی کے لیے آنے والوں کو فاتحہ خوانی کے بغیر واپس کر دیا، لیکن بعد میں کیا ہوا پہرے بے اثر ہو گئے لوگ جوق در جوق آتے رہے چھوٹے چھوٹے ہجوم عظیم الشان بری میں تبدیل ہو گئے۔ جن قیدیوں کی قبروں پر پہرے بٹھائے جاتے ہیں وہاں زیارت گاہ بن جاتی ہے لوگوں کا میلہ لگ جاتا ہے۔

جنرل ضیاء اور ان کے ساتھیوں نے شہید بھٹو کے خلاف ملک کی اعلیٰ عدالتوں سے فیصلے دلوائے لیکن لگتا ہے وہ خود بھی عدالتوں کے فیصلے سے مطمئن نہ تھے اس لیے انہوں نے بھاری کتابیں لکھ کر خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ناکام رہے ہیں کتابیں پڑھیں تو تضادات سے بھری پڑی ہیں ان میں سے ایک کتاب جنرل کے ایم عارف کی بھی ہے، ساری کتاب پر اس وقت تو تبصرہ نہیں ہو سکتا لیکن تحریر کا یہ مختصر سا ٹکڑا پڑھنے سے ہی حقیقت سامنے آ جاتی ہے، جنرل کے ایم عارف صاحب کہتے ہیں، ''میں نے بے نظیر بھٹو اور مسز نصرت بھٹو سے

www.bhutto.org

3 اپریل 1979ء کو چار گھنٹوں تک اکٹھے ملاقات کی انہیں بتایا گیا کہ آخری ملاقات ہے۔ کچھ دیر بعد خود جیل سپرنٹینڈنٹ مسٹر بھٹو کی کوٹھڑی پہنچے ان کی اہلیہ اور بیٹی کی موجودگی میں مسٹر بھٹو کو بتایا کہ کل صبح انہیں پھانسی دے دی جائے گی، مسٹر بھٹو نے اپنی اہلیہ اور بیٹی کے سامنے کسی سراسیمگی کا مظاہرہ نہ کیا اور اس طویل ملاقات کے دوران اپنے آپ کو سنبھالے رکھا مسز بھٹو بہت افسردہ تھیں تاہم وہ خاموش رہیں، مس بے نظیر البتہ کئی بار بے ہوش ہوئیں کئی بار صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹا، آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے اور سسکیاں بھرتی رہیں"۔ آگے چل کر کے ایم عارف صاحب بھٹو شہید پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اس طرح ایک ایسا شخص اپنے انجام کو پہنچا جس کا کبھی یہ دعویٰ تھا کہ پاکستان میں صرف میں ہی وہ فرد واحد ہے جو خطا سے پاک ہے" جنرل عارف صاحب تلخ لہجہ بولتے اچانک نرم ہو جاتے ہیں کہتے ہیں "مسٹر بھٹو کی پھانسی نے پورے ملک کو حیرت میں ڈال دیا، اگرچہ غم واندوہ اور اداسیوں کی ایک فضا پورے ماحول پر محیط ہو گئی" جنرل صاحب اتنا کہہ کر پھر تذکرہ کرتے ہیں کہ "بعض جگادری پنڈتوں نے پیش گوئی کی تھی، نہ کوئی ہمالہ رویا نہ دریائے خوں رواں ہوئے" آخری لمحات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "شام کو ساڑھے چھ بجے سپرنٹینڈنٹ جیل ایک گواہ کے ہمراہ بھٹو کی کوٹھڑی میں گئے، انہوں نے دیکھا کہ وہ فرش پر ایک دیوار سے پشت لگا کر بیٹھے ہیں ان سے پوچھا گیا کہ چونکہ انہیں اگلی صبح پھانسی دی جائے گی، کیا وہ آخری خواہش بتانا چاہیں گے یا آخری وصیت تحریر کرنا چاہتے ہیں؟ مسٹر بھٹو نے وصیت تحریر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور انہیں لکھنے کے لیے ضروری کاغذات اور سامان دیا گیا۔۔۔۔ مسٹر بھٹو نے عبدالحفیظ پیرزادہ اور دوسرے رشتہ داروں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔۔۔۔۔ انہوں نے شیو کرنے کا سامان طلب کیا اس گفتگو کے دوران وہ نارمل رہے اور کسی قسم کی پریشانی اور اضطراب کا مظاہرہ نہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے قدم اٹھانا چاہا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اس کے بعد انہوں نے مشقتی کو اونچی آواز سے بلایا اور شیو کرنے کے لیے گرم پانی لانے کو کہا اور بولے میں داڑھی والے ملا کی موت مرنا نہیں چاہتا۔

مسٹر بھٹو نے شیو کے بعد کافی کا ایک کپ پیا اور شیو بنائی پھر رات کو 8 بجکر 5 منٹ پر

www.bhutto.org

کافی کا ایک کپ اور پیا، اس کے بعد دفعتاً ان کی خود اعتمادی نے جواب دے دیا انہوں نے بے مقصد چاروں طرف نظر دوڑائی اور بچوں کی طرح اونچی آواز میں رونے لگے۔ اس کے بعد 8 بجکر 15 منٹ سے لے کر 9 بجکر 4 منٹ تک کاغذ پر کچھ لکھتے رہے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ذہن پر بہت سے خیالات کی یورش ہے اور ذہنی طور پر پریشان ہیں پھر انہوں نے میز پر پڑی چیزوں کو ترتیب سے رکھنا شروع کیا پھر وہ ترتیب کو درہم برہم کر دیتے یہ عمل بار بار دہراتے رہے۔ 9 بجکر 55 منٹ پر انہوں دانتوں کو برش کیا اس کے بعد ان کی حرکات کچھ زیادہ ہی بے ربط ہو گئیں ۔10 بجے شب انہوں نے ایک کاغذ کے ٹکڑے سے اپنی کوٹھڑی کے فرش پر جھاڑو دینا شروع کر دیا اس کے بعد ان کا اعتماد گویا ایک بار پھر بحال ہو گیا وہ بستر پر دراز ہو گئے دیوار سے لگے لگے 10 بجکر 10 منٹ سے 11 بجکر 5 منٹ شب تک پھر کچھ لکھتے رہے انہوں نے ہیڈ وارڈ سے دریافت کیا کہ ان کی سزائے موت میں کتنا وقت باقی ہے اس کے بعد مسٹر بھٹو نے لکھے ہوئے کاغذ جمع کر کے جلا دیئے مشقتی کو آواز دے کر کہا کہ کوٹھڑی کی صفائی کر دو۔ ان کا چہرہ پھر اتر گیا تھا۔ وہ بستر پر دراز ہو گئے، آنکھیں موند لیں یوں لگا جیسے سو رہے ہیں۔ 11 بجکر 50 منٹ پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل ان کی کوٹھڑی میں آئے اور مسٹر بھٹو کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہ ملا انہوں نے ٹیلی فون پر سپرنٹینڈنٹ کو اطلاع دی تھوڑی دیر میں وہ ڈاکٹر کے ساتھ پہنچ گئے مسٹر بھٹو کو بازو سے پکڑ کر جگایا تو وہ جاگ گئے ڈاکٹر نے معائنہ کیا تو بالکل فٹ تھے۔ مجسٹریٹ نے پوچھا کہ کوئی وصیت تحریر کی ہے۔ مسٹر بھٹو جسمانی طور پر کمزور تھے لیکن ذہنی اعتماد سے چاق چوبند تھے انہوں نے آہستگی سے کہا "وصیت تو کتابوں میں لکھی جائے گی"

ساری کتاب خاص طور پر شہید بھٹو کی شہادت اور اس کے بعد کا حصہ تضادات سے بھرا ہوا ہے۔ جنرل ضیاء اور اس کے ساتھی جس بھٹو کو مجرم، ظالم اور ملک دشمن ثابت کرتے رہے وہ اب کتابیں لکھ کر بھی وہی کچھ کر رہے ہیں ان کا بھٹو کے لیے بار بار لہجہ تبدیل ہو رہا ہے۔ کبھی ان کا بھی قاتلوں کی طرح تو کبھی مظلوموں کی طرح تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ اندر سے اٹھنے والا یہ کون سا احساس اور جذبہ ہے جس کی وجہ سے کہتے ہیں "ماہ اپریل کی اس اداس اور افسردہ شب پر خاموشی

www.bhutto.org

طاری تھی سب لوگ افسردہ منظر دیکھتے ہوئے حیران وساکت کھڑے تھے غم واندوہ اور اداسیوں کی ایک فضا پورے ماحول پر محیط ہوگئی" پھر کہتے ہیں" کوئی ہمالہ رویا نہ دریائے خوں رواں ہوئے" میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا میں اتنا کہتا ہوں کہ جنہیں ابن آدم کا رونا سمجھ میں نہیں آیا انہیں ایک پہاڑ کے آنسو کیسے سمجھ میں آئیں گے۔ یہ تحریر پڑھ کر لگتا ہے کہ محترم مصنف پل پل بھٹو صاحب کو دیکھتے آرہے تھے اور ان کی ذہنی کیفیت کا بھی اندازہ لگا رہے تھے 600 صفحات پر مشتمل کتاب پر تفصیلی تبصرہ کرنا بھی ممکن نہیں لیکن اتنا کہا جاسکتا ہے کہ یہ کس درد کا مداوا تھا اور کیا ضرورت تھی جس کی وجہ سے بھٹو صاحب کے ہر عمل کا وقت نوٹ کیا جارہا تھا اور تحریری طور پر بیان کرنا بھی ضروری ہوگیا تھا۔

شاید کہ قدرت کا انتظام تھا یا ضمیر کا کرشمہ، کہ جنرل ضیاء کے دست راست ہی زندان میں بھٹو کے شب و روز محفوظ کر رہے تھے ورنہ بھٹو کے چاہنے والوں کو کیسے پتہ چلتا کہ ان کے محبوب اور غیرت مند لیڈر نے کتنی جسمانی اور ذہنی اذیتیں برداشت کیں۔ لاریب کہ وقت اپنی آواز کو خود ہی محفوظ کرتا ہے، تاریخ اپنی گواہیوں کی حفاظت کا انتظام خود کرتی ہے۔

یہ تحریر گواہی دے رہی ہے کہ بھٹو آخری دن تک باشعور اور باہمت ہونے کا ثبوت دے گئے ہیں وہ بتا گئے ہیں کہ وہ زندگی اور موت کی حقیقت جانتے ہیں اور وہ تاریخ کا ادراک رکھتے ہیں، تب ہی تو وہ تاریخ کے ہاتھوں مرنے کو پسند نہیں کرتے تھے تب ہی تو انہوں نے تختہ دار کی طرف جاتے ہوئے کہا تھا کہ "اب وصیت کتابوں میں لکھی جائے گی"

جناب ایئر مارشل اصغر خان کی کتاب "تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا" کچھ مختلف کتاب ہے اس کتاب میں قابل احترام مصنف اپنی فوجی زندگی سے لے کر سیاسی زندگی تک اپنا تعارف ایک اصول پسند شخصیت کے طور پر کرواتے ہیں اس وجہ سے ہی اس کتاب میں کہیں کہیں بھٹو صاحب کے حوالے سے تعریفی جملے بھی لکھے گئے ہیں لیکن پوری کتاب گواہی دے رہی ہے کہ جناب اصغر خان صاحب بھی آخر ایئر مارشل رہ چکے ہیں وہ بھی بھٹو صاحب کو رعایت کیسے دے سکتے ہیں۔ بھٹو صاحب انسان تھے اور ایک انسان کی حیثیت سے وہ خطاؤں سے پاک نہ

www.bhutto.org

تھے۔ وہ حکمران بھی تھے یقیناً ریاستی معاملات، مفادات اور حکمت عملیوں اور اپنی پارٹی کے پروگرامز کے نفاذ کی وجہ سے کچھ غلطیاں بھی ہوئی ہونگی، کہیں تنقید کرنے والوں کو خواہ مخواہ موقعہ بھی ملا ہوگا لیکن اصول پسند تجزیہ اور تنقید کرنے والوں کو بھی چاہیے کہ وہ بھٹو صاحب کی کوتاہیاں بیان کے ساتھ وہ اپنی غلطیاں بھی بیان کریں، اس کتاب میں بھٹو صاحب کو غلطیوں، سازشوں اور ظالمانہ کاروائیاں کرنے والا سیاستدان اور حکمران ثابت کیا گیا ہے لیکن اپنی غلطی کسی دور کے حوالے سے بھی بیان نہیں کی گئی یہاں تک کہ کہیں تو دوسرے سیاستدانوں کو بھی سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا لیکن مصنف نے اپنے معاملے میں ہر کوتاہی اور غلطی کو خود سے دور دکھایا ہے۔

انہوں نے کبھی بھی تسلیم نہیں کیا کہ انہوں نے پی۔ این۔ اے تحریک کے دوران حکومت سے بات چیت کرنے کی حوصلہ افزائی کر کے ملک کو بحران سے بچانے کی کوشش کی ہے کہیں کہیں ہلکا سا اعتراف ضرور کرتے ہیں کہ وہ پی۔ این۔ اے رہنماؤں کو بھٹو صاحب سے بات چیت کرنے سے منع کرتے رہے اب جب کہ سیاستدان ایئر مارشل صاحب پر مارشل لاء لگوانے کی ذمہ داری عائد کر چکے ہیں تب بھی وہ اس بات کا اعتراف نہیں کرتے کہ انہوں نے ہی فوج کو مداخلت کرنیکی اپیل کر کے جمہوریت کے سفر کو کئی سال تک روک دیا۔

جناب اصغر خان صاحب اس پوری کتاب میں اپنے ساتھ زیادتیوں کا بڑا تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ زیادتیاں ایسی نہیں کہ جن کا سامنہ پاکستان جیسے ملک میں کسی دوسرے سیاستدان نے نہ کیا ہو، بھٹو صاحب پر تو ایوب دور میں کئی قاتلانہ حملے ہوئے ان حملوں میں لوگ زخمی اور شہید بھی ہوئے کئی بار ان کو تقریر کرنے سے روکا گیا، ایوبی دور کا ہر دن بھٹو صاحب کے لیے سیاسی آزمائش کا دن تھا لیکن اصغر خان صاحب نے ان عام رکاوٹوں کے تذکرے سے کتاب کا بہت سا حصہ بھر دیا ہے۔ میں نے ان کی تکالیف کے لیے عام کا لفظ استعمال کیا ہے کہ انہوں نے خود کتاب میں فرمایا ہے کہ "بھٹو کے پانچ سالہ دور اقتدار میں مجھے خصوصی طور پر کافی حد تک آزادی حاصل رہی تھی۔ اگرچہ کبھی بھی بیک وقت ایک رات سے زیادہ محبوس نہ رہا تھا، مجھے گرفتاری کی توقع بھی نہ تھی" لیکن یہ کہتے ہیں کہ "پیپلز پارٹی کے پانچ سالہ دور میں ہمیں عوام تک

www.bhutto.org

رسائی کی آزادی حاصل نہ تھی اور نہ ہی ہم ایسا موقعہ تلاش کر سکے"۔

جناب ایئر مارشل اصغر خان صاحب نے پی۔این۔اے تحریک میں حکومتی مظالم کا بڑا تذکرہ کیا ہے لیکن، پی۔این۔اے کی تحریک کے آغاز میں ہی کراچی، حیدرآباد میں پی پی کے کارکنوں پر حملوں، لوٹ مار، اور کارکنوں کو زندہ جلا دینے اور لاشوں کو شاہراہوں پر لٹکا دینے کا ذکر بالکل نہیں کیا۔ اصغر خان صاحب اس تحریک کے دوران فوج کو ہاتھ سے وکٹری نشان دکھانے والے نوجوان کو اہلکاروں کی طرف سے گولی مار دینے کا ذکر بار بار کیا ہے، کرنا چاہیئے اس واقعہ کی مذمت ہر باشعور سیاسی آدمی کریگا، لیکن حیرانگی ہے کہ ایم، آر، ڈی، جس کے وہ خود بھی موقعہ بہ موقعہ سربراہ بنتے رہے اس تحریک کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا، اس تحریک کے دوران پر امن لوگوں کو قرآن شریف پڑھتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بنانے کو بالکل ہی بھول گئے، ان کو یاد نہیں آیا کہ اس تحریک کے دوران سندھی لوگوں کے گھروں اور گاؤں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا ہزاروں لوگوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ اس تحریک میں ایسا ایک بھی شہر نہیں تھا جہاں ریاستی کارندوں کے ہاتھوں لوگ مارے اور زخمی نہ کیے گئے ہوں، قابل احترام اصغر خان کو جنرل ضیاء کے دور میں سندھ پر ہونے والے کسی ظلم کی یاد نہیں آئی۔

بھٹو صاحب کی حکومت کے زمانے میں پارٹی کے کارکنوں کو مسلح کرنے یا کوئی مسلح ذیلی تنظیم بنانے کا الزام غلط ہے۔ یہ ہے کہ حکومت سے پہلے پیپلز گارڈ کے نام سے کارکنوں کی تنظیم بنائی گئی تھی یہ پارٹی کے جلسوں اور جلوسوں کو منظم رکھنے کے لیے بھی تھے اور مختلف مقامات پر کارکنوں اور قائد پر حملے کے اندیشے کے پیش نظر بھی بنائی گئی تھی لیکن حکومت میں آنے کے بعد پیپلز گارڈ کا کوئی وجود نہ تھا اصغر خان صاحب اس بات پر بڑی تنقید کرتے ہیں لیکن اس مقصد کے لیے خود کارکنوں کو مسلح کرتے ہیں تو کوئی برائی کی بات نہیں لگتی وہ اس کتاب میں لکھتے ہیں کہ "پاکستان میں اسلحہ رکھنا عام سی بات ہے لہٰذا ہمارے جن کارکنوں کے پاس اپنا ذاتی اسلحہ تھا انہوں نے خود مسلح دستے تیار کر کے سیاسی اجتماعات کے دوران حفاظتی ذمہ داریاں سنبھالنے کا فریضہ ادا کیا" ایئر مارشل صاحب کہتے ہیں کہ ان کی پارٹی بھٹو دور میں آگ اور خون میں گزر کر ایک قوت

www.bhutto.org

بن کر ابھری ان کو حق ہے کہ وہ اپنی پارٹی کے لیے کہیں تو پورا پاکستان بھی تو دیکھ رہا ہے اس دعوؤں کو وہ بھی تو دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان کے کس علاقے میں ان کی پارٹی قوت بن کر ابھری؟ جناب اصغر خان صاحب کبھی کہتے ہیں کہ بھٹو کی مقبولیت ختم ہوگئی۔ لوگ ان سے باغی ہو گئے لیکن پھر آپ ہی کہتے ہیں کہ "3 ستمبر کو بھٹو کو نواب احمد خان کے قتل میں گرفتار کیا گیا، پھر 13 کو ضمانت پر رہا کر کے 17 ستمبر کو پھر گرفتار کر لیا گیا، لیکن 20 ستمبر کو ہی پی پی کی طرف سے انتخابی مہم کے آغاز میں بیگم نصرت بھٹو کے جلسہ عام میں ایک لاکھ کے قریب لوگ شریک ہو گئے۔ ایئر مارشل صاحب اس کتاب میں کہیں کہتے ہیں کہ پیپلز پارٹی انقلابی مزاج والی اور بڑی محنت سے قائم کی گئی پارٹی تھی لیکن اسی پارٹی کے لیے پھر کہتے ہیں "پیپلز پارٹی شخصیت پرستی کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی اور اپنے بانی کی موت کے بعد اپنے زخم چاٹ رہی ہے" یہ کتاب موجودہ دور تک سیاسی حالات کا تذکرہ ہے اور اس دور تک پہنچتے پہنچتے پیپلز پارٹی نے اپنے آپ کو ایک زندہ جاوید سیاسی حقیقت کے طور پر تسلیم کرا لیا ہے۔ پی پی نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ صرف شخصیت پرستی کی بنیاد پر قائم نہیں ہوئی تھی یہ سچ ہے کہ شہید ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت آج بھی پیپلز پارٹی کی پہچان بنی ہوئی ہے لیکن اس شخصیت کا دیا ہوا شعور اور رہنمائی آج بھی پارٹی کو جمہوریت اور محض سماجی تبدیلی کی راہ پر رواں دواں رکھے ہوئے ہے پیپلز پارٹی، قید، کوڑے پھانسیاں، جلاوطنی کے کئی دریا عبور کر کے بھی زندہ ہے اور انشاء اللہ آنے والے دنوں میں بھی محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت میں عوام کی رہنمائی کرتی رہے گی، جب کہ قابل احترام اصغر خان صاحب جس پارٹی کی کامیابی، قربانیوں، لگن اور جدوجہد کی بات کرتے ہیں وہ کب کی قصہ پارینہ بن چکی ہے۔

قابل احترام اصغر خان صاحب نے کئی بار جمہوری جدوجہد میں ساتھ بھی دیا ہے لیکن اس کتاب میں وہ اپنی رائے سے بڑھ کر کسی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے، اپنے سوا کسی کو بھی اصول پرست، درست موقف رکھنے والا تسلیم نہیں کرتے اس کتاب کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ محترم و مکرم مصنف کے قلم سے بھٹو مخالفت ایک پل کے لیے بھی جدا نہیں ہوئی۔ ایئر مارشل اصغر خان صاحب نے لکھا ہے کہ ہم نے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا لیکن یہ بھی تو درست ہے کہ ہم نے

www.bhutto.org

تاریخ کو درست بھی تو نہیں لکھا۔

بھٹو دشمنی میں لکھی ہوئی سب کتابوں میں سے کوئی کتاب پڑھنے کے لائق اور دلچسپ کتاب ہے تو وہ جناب ایس ایم ظفر صاحب کی کتاب ''ڈکٹیٹر کون'' ہے بڑی ہی پرفریب اور دانشورانہ انداز میں لکھی ہوئی ہے اس کتاب پر تبصرے کی گنجائش تو جناب ظفر صاحب نے یہ تحریر کر کے ختم کر دی ہے کہ ''ڈکٹیٹر کون'' کا اصل موضوع بھٹو ہی تھا اور اس ضمن میں چھ حوالہ جات پیش کیے گئے، جن کا پوری طرح اطلاق بھٹو پر ہی ہوتا ہے۔

جناب ایس، ایم، ظفر صاحب بین الاقوامی سطح کے وکیل اور وسیع مطالعہ رکھنے والے معروف دانشور ہیں اس کتاب میں بھی ظفر صاحب اپنے ہم خیال حلقہ احباب کے وکیل بن کر آئے ہیں۔ یہ کتاب کسی غیر جانبدار مورخ یا تجزیہ نگار کی تحریر نہیں بلکہ بھٹو صاحب کے خلاف ایک ذہین وکیل کا بنایا ہوا کیس ہے۔ ایسا وکیل جسے بھٹو کے خلاف ملکی عدالتوں میں مجرم ثابت کرنے کا موقعہ نہیں دیا گیا وہ اب یہ ذمہ داری کتابوں میں نبھا رہا ہے یہ کتاب بھٹو صاحب کے خلاف دنیا بھر کے مثالوں اور دلیلوں سے بھری ہوئی فرد جرم ہے۔

یہ فرد جرم ظفر صاحب کے حامیوں، ہم خیال، بھٹو مخالفوں کو تو متاثر کر کے داد تحسین وصول کر سکتی ہے لیکن بھٹو کے چاہنے والوں اور ایک غیر جانبدار، حقیقت پسند، اور علم دوست قاری کو الجھا کر اپنا ہمنوا نہیں بنا سکتی، کیوں کہ اس کی پہلی دلیل ہی غیر متاثر کن اور حقیقت سے انحراف کرنے کے مترادف ہے اس میں کہا گیا ہے کہ ''اگر چہ محمد ایوب خان اس تعریف کے مطابق جو ہم نے ڈکٹیٹر کے متعلق پیش کی ہے۔ ڈکٹیٹر شپ کی ذیل میں آتے ہیں۔ تاہم وہ محب وطن اور نیک نیت تھے'' اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ ڈکٹیٹر شپ جس کی برائیاں بیان کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی اس سے نیکی کی توقع بھی کی جا سکتی ہے۔ ظفر صاحب کی اس دلیل سے خود ان کا موقف کمزور ہو جاتا ہے کہ ڈکٹیٹر کی صورت میں انسان دشمن اور ملک و قوم کے لیے ہر حال میں عذاب ہے اس تحریر سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ ایوب خان کو صرف ڈکٹیٹر شپ کی تعریف کی وجہ سے مجبوراً ڈکٹیٹر تسلیم کیا جا رہا ہے ورنہ وہ قوم کے بڑے معمار اور محسن تھے، کتاب میں کہا گیا ہے کہ ''جس

www.bhutto.org

طرح نپولین کے پیش روؤں نے ان سے پہلے آسانی پیدا کر دی تھی، اسی طرح ایوب خان کے پیش روؤں نے آسانی پیدا کر دی تھی۔ ایوب خان سے پہلے ملک کی سیاسی فضا اس قدر مکدر ہو چکی تھی کہ ملک بچانے کا نعرہ بلند کر کے فوج کو اپنا ہمنوا بنا لینا انکے لیے کچھ مشکل نہ تھا اس کے علاوہ ایک حد تک قوم بھی تبدیلی کے لیے تیار ہو چکی تھی'' اس تحریر میں تو ظفر صاحب نے ساری گل ہی مکا دی ہے۔ یہ بات نہ صرف ظفر صاحب کی فکر، نقطہ نظر اور آمریت کے خلاف تبلیغ کے جذبہ کی نفی کرتی ہے کیوں کہ اس بات نے نہ صرف ایک ڈکٹیٹرشپ کے قیام کو جائز کر دیا ہے بلکہ آنے والی ڈکٹیٹرشپ کی مذمت کرنے کی بھی گنجائش ختم کر دی ہے۔ ڈکٹیٹرشپ کے خلاف اتنی مدلل کتاب تحریر کرنے والے دانشور سے اس بات کی توقع نہیں تھی وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ملک کے حالات کتنے بھی مکدر تھے پھر بھی فوج کے سربراہ کو اقتدار پر قبضہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور اگر قوم تبدیلی کے لیے تیار ہو چکی تھی تو تبدیلی کی خواہش کا مطلب مارشل لاء ہرگز نہیں تھا حیران کن بات یہ ہے کہ جب جنرل ایوب خان کی طرف سے اقتدار پر قبضہ کو تحفظ فراہم کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ اس وقت قوم بھی تبدیلی کے لیے تیار ہو گئی تھی، لیکن وہی افراتفری ایوب خان کی آمرانہ حکومت کی وجہ سے عوامی بے چینی کی صورت میں ظاہر ہوئی تو ظفر صاحب کہتے ہیں کہ سارا قصور سیاستدانوں اور خاص طور پر بھٹو صاحب کا تھا، ورنہ ایوب کا دور بالکل ہی سکون سے جاری تھا۔ اس کتاب میں کہا گیا ہے کہ ''بھٹو کی پروپیگنڈا کی نئی تیکنیک کی وجہ سے ایوب خان کی نیک نامی اور شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا'' گویا ڈکٹیٹر نیک نام، اچھی شہرت کے مالک بھی ہوتے ہیں۔ اگر یہ بھی سچ ہے تو متذکرہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی، ظفر صاحب کو ایوب خان کے خلاف ملک کی سب پارٹیوں کی جدوجہد اور تمام طبقات سے وابستہ افراد کا احتجاج بالکل نظر نہیں آیا، گلی گلی میں ایوب خان کے خلاف بلند ہونے والے نعرے بالکل سنائی نہیں دیئے، کتاب میں کہا گیا ہے کہ ''ایوب خان کے زمانے میں بلاشبہ ملک نے اقتصادی لحاظ سے بہت ترقی کی، لیکن وہ ترقی کچھ اس طرح تقسیم ہوئی کہ اس کا عام لوگوں کو فائدہ نہ پہنچ سکا'' جب ترقی سے عوام کو فائدہ نہ ہو تو وہ ترقی ملکی ترقی کیسے کہلائے گی، اصل میں ایوب خان کے دور میں ملکی ترقی نہیں بلکہ اقربا

www.bhutto.org

پروری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھاری کارخانے اور ذرائع پیداوار چند افراد میں تقسیم کیے گئے، اس دور میں چند گنے چنے لوگوں کو امیر سے امیر بنا دیا گیا تھا، کتاب کی مندرجہ بالا تحریر میں بھی کتنی دانائی سے ایوب خان کی اقرباء پروری کو چھپایا گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر کتاب میں کہا گیا ہے کہ ایوب خان کو اقتدار سے الگ نہ کیا جاتا تو مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے الگ نہیں ہوتا، یہ بات بھی آج اکیلے ظفر صاحب ہی کر رہے ہیں، ورنہ پورے ملک کے لوگ متفق ہیں کہ پاکستان اب تک ایوب خان کے کیے دھرے کو ہی بھگت رہا ہے۔ ایوب خان نے سیاسی انتشار میں فوجی مداخلت کر کے غیر سیاسی حکومت قائم کرنے کی بنیاد ڈالی، نہ صرف پہلا مارشل لاء نافذ کیا بلکہ آنے والے ہر مارشل لاء کا راستہ صاف کر دیا، اسی دور میں ہی غیر جماعتی انتخابات کی بدعت کی بنیاد ڈالی گئی اسی دور میں ہر آمر کو بلدیاتی اداروں کو بنیادی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا سبق دیا گیا اس دور میں بانی اور مقبول سیاسی جماعت مسلم لیگ کو توڑ کر اپنا گروپ کنونشن مسلم لیگ بنا کر سیاسی پارٹیوں میں انتشار اور توڑ پھوڑ کروانے اور اپنے حکومتی حامی گروپ بنانے کی روایت نے جنم لیا۔ یہ ایوب خان کا ہی دور تھا جس میں صوبوں کے درمیان دوری عروج کو پہنچ گئی، خاص طور پر بڑے صوبے کے خلاف محاذ آرائی کے اسباب بھی اسی دور میں پیدا ہوئے، اسی ایوب خان کی سرپرستی میں بنگلہ دیش مشرقی پاکستان کے حقیقی نمائندوں کو پاکستان سے دور سے دور کیا جاتا رہا۔

یہ کتاب پڑھ کر لگتا ہے کہ شاید ظفر صاحب کو ایوب خان سے بڑا روحانی لگاؤ تھا اسی لیے ساری کتاب میں ایوب خان کے قومی داغ دھونے کی کوشش ہوتی رہی ہے اور مصنف صاحب بھٹو شہید کو ایوب خان کے اقتدار سے علیحدگی کا ذمہ دار سمجھتے ہیں، اس لیے یہ کتاب لکھ کر ہر حوالے سے بھٹو صاحب کے مثالی قومی کردار کو مسخ کرنے کی بہت بڑی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن حیرانی بھی ہوتی ہے کہ بھٹو صاحب سے اتنی دشمنی ہونے کے باوجود ان کی طرف سے وزارت قانون کو فوری طور پر کیوں نہیں ٹھکرا دیا گیا؟ کتاب میں لکھا گیا ہے کہ جب جناب محمود علی قصوری کو وزارت قانون سے الگ کیا گیا تھا تو قابل قدر مصنف کو بھٹو صاحب نے اسلام آباد میں دعوت دے کر وزارت قانون کی پیش کش کی تھی لیکن انہوں نے اس وقت پیش کش نہیں ٹھکرائی بلکہ جناب

www.bhutto.org

محمود علی قصوری صاحب کی علیحدگی کے اسباب معلوم کر کے اندازہ لگایا کہ بھٹو اچھی ذہنیت کے مالک نہیں، کتاب کی تحریر ہے کہ" مجھے ذوالفقار علی بھٹو نے اسلام آباد آنے کی دعوت دی کہ مجھے میاں صاحب کی جگہ وزیر قانون بنانا چاہتے ہیں، اس پر میں نے میاں صاحب سے دریافت کیا کہ ناراضگی کا سبب کیا ہے۔ انہوں نے جو وجوہ بیان کی وہ بے تکی اور غیر معقول تھیں اس سے میں نے اندازہ کرلیا کہ ذوالفقار علی بھٹو ذہنی اعتبار سے قطعی طور پر ایک تشدد طبع ڈکٹیٹر ہیں، ان کے دربار میں علم وفضل کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔۔۔۔ چنانچہ میں نے بھٹو کی ذہنیت معلوم کرنے کے بعد وزارت قانون کا منصب قبول کرنے سے قطعی معذرت کرلی۔" تحریر کے اس ٹکڑے سے ظاہر ہے کہ ظفر صاحب خود کو علم وفضل کے مالک تصور کرتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ ایوب خان کے ساتھ سالہا سال کابینہ میں کام کرتے ہوئے، کنونشن مسلم لیگ منظم کرتے ہوئے کئی سفر ساتھ کرنے کے باوجود ظفر صاحب کو بھٹو صاحب کی ذہنیت کا کبھی پتہ نہیں چل سکا اور قصوری صاحب کی بات پر یقین کر لینے سے بھٹو کی ساری ذہنیت سمجھ میں آ گئی، کتاب میں بھٹو صاحب کے سارے سیاسی زمانے پر شدید تنقید کی گئی ہے، یہ تنقید بھٹو صاحب کے اقتدار میں آنے سے قبل والے دور پر بھی ہے شاید اسی دور کے حوالے سے سنگین الزام لگائے جا رہے ہیں۔ جیسا کہ مشرقی پاکستان کے سانحہ کے ذمہ دار ہونے کے ساتھ، 1965ء کی ہندوستان پاکستان جنگ کا ذمہ دار بھی بھٹو صاحب کو قرار دیا گیا ہے۔ اور کتاب میں نواب کالاباغ جو کہ خود بھی بھٹو مخالف تھے کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ بھٹو صاحب لاہور پر ہندوستان کا قبضہ کروانا چاہتے تھے۔ (ان الزامات کے علاوہ دوسرے الزامات لگا کر تو ظفر صاحب بھٹو دشمنی میں دوسرے بھٹو مخالفین سے بھی آگے نکل گئے ہیں) اور پھر خود ایوب خان جو کہ ظفر صاحب کے محبوب رہنما تھے ان کو بھی حکومت سے بھٹو نے الگ کیا۔ تو ظاہر ہے کہ یہ سارے الزام بھٹو کے اقتدار میں آنے سے پہلے کے زمانے کے تھے تو پھر وزارت قانون کی پیش کش کو قبول کرنے کے متعلق پوچھنے کی کیا ضرورت تھی فوری طور پر انکار کیوں نہیں کیا گیا؟۔

کتاب میں ہے کہ" میں نے اس یقینی اور حتمی نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ ملک وقوم کے

www.bhutto.org

لیے ماشل لا مقدر ہو چکا ہے ایوب خان کو اپنا استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ فیلڈ مارشل اپنے ہی ساتھی اور وفادار کو دیکھتے ہوئے سوچتے ہوں گے کہ ''ہر شے بدل رہی ہے کہیں تم بدل نہ جانا'' ڈکٹیٹرشپ کے دشمن ظفر صاحب کو ایوب خان کے پورے دور میں آمریت کی کوئی علامت نظر نہیں آئی جس میں اختلاف کر کے حکومت سے الگ ہو جائیں، مزہ تو تب تھا جب پورا ملک آمریت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا جب آمریت کے عالم عروج میں حکومت سے الگ ہو جاتے، مشکل وقت میں محسنوں اور محبوبوں کو چھوڑا نہیں جاتا۔

ایوب دور کے بعد بھی کئی بار ظفر صاحب ''ایک یقینی اور حتمی نتیجے'' پر پہنچ کر مختلف پارٹیوں سے الگ ہوئے ہیں لیکن جس اصول پر وہ ساری سیاسی زندگی میں ڈٹ کے کھڑے رہے ہیں وہ بھٹو مخالفت کا اصول ہے۔ اس لیے ہی ان کی کتاب کے ہر صفحہ اور سطر میں نئے نئے انداز سے بھٹو صاحب کو مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کئی سنے سنائے الزامات عائد کیے گئے ہیں کئی گھڑے ہوئے واقعات حوالہ بنا کر پیش کیے گئے ہیں کتنے ہی واقعات کی حقیقت کو چھپایا گیا ہے۔ کتنے ہی جرائم کے اصل ذمہ داروں کی پردہ پوشی کی گئی ہے۔ ہر مخالف کی طرح اس کتاب میں بھی بھٹو صاحب کے خلاف عدالتی فیصلے کو سند کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس فیصلے پر دنیا کی رائے کیا ہے۔ یہ اب ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ ہاں مخالفوں کو بات بنانے کا ایک موضوع اور مل گیا ہے۔ ورنہ یہ فیصلے دینے والے بھی فیصلہ دینے کے بعد کبھی گردن فخر سے اونچی کر کے پاکستان میں گھوم نہیں سکے۔ اس مقدمے کے سب کردار گمنامی کی زندگی گزارتے رہے ہیں اس عدالت کے ایک منصف جو عدالت عظمیٰ کے سربراہ بھی بنے انہوں نے تو دنیا کے سامنے اقرار کر دیا ہے کہ فیصلہ حکومتی دباؤ کے تحت دیا گیا تھا اور بھٹو کو دی جانے والی سزا انصاف کے مطابق نہ تھی۔ سب وکلاء جانتے ہیں کہ اس فیصلے کی مثال تو شرمندگی کی وجہ سے پاکستانی عدالتوں میں بھی نہیں دی جاتی۔ دنیا کے کئی ممالک اور مذاہب کے علاوہ عالم اسلام کی تاریخ میں بھی ایسے کئی عدالتی فیصلے موجود ہیں جن پر صدیاں گزرنے کے باوجود عدالتیں شرمندہ ہیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ زندگی کا ہر اذیت ناک خاتمہ شامت اعمال نہیں ہوتا۔

www.bhutto.org

صاحب علم و فضل وہ نہیں جو اپنے علم و فضل کی تعریف خود کرے، علم و فضل تو وہ ہے کہ جسے دنیا تسلیم کرے جس کی سچائی کی گواہی وقت دے، حالات دیں، بھٹو نے برسوں پہلے جو باتیں کی تھیں وقت انہیں درست ثابت کر رہا ہے۔ دنیا اور عالم اسلام بھٹو کے دور کو یاد کرتا ہے۔ ادارے ان کی کہی ہوئی باتیں اور پیش گوئیاں شائع کر رہے ہیں۔ تاریخ کے طالب علم جان لیں کہ بھٹو اب تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں اب ان کا فیصلہ ان کے متعصب اور حاسد ہم عصر نہیں بلکہ تاریخ کرے گی۔

یہ ہر آدمی کی سوچ پسند و ناپسند اور علم اور انصاف پسندی پر منحصر ہے کہ وہ کسے ڈکٹیٹر شپ کی تعریف کے مطابق ڈکٹیٹر کے زمرے میں آنے کے باوجود معاف کر دے اور کس کس کو اپنے فکری کٹہرے میں کھڑا کر دے۔ آپ لینن کو بھی ڈکٹیٹر کی قطار میں کھڑا کر سکتے ہیں جن کی فکر، سیاست اور جدوجہد نے دنیا کی آمریتیں مٹا دیں کئی شہنشاہوں کو ملک بدر ہونے پر مجبور کر دیا انہوں نے پسماندہ لوگوں کو بھی حاکمیت کا انداز اور راستہ دکھایا۔ آپ سویکارنو کا نام تو لیتے ہیں لیکن لاکھوں لوگوں کو قتل کرنے والے سوہارتو کو یاد نہیں کرتے۔

آمر اور عوامی رہنماء میں بڑا فرق ہے آمر کتنی بھی طاقت حاصل کر لے کتنا ہی عرصہ حکومت کر لے لیکن اس کے جب پیر اکھڑتے ہیں تو اس کی سب نشانیاں مٹا دی جاتی ہیں۔ اس کی یادیں رات کے اندھیرے میں کیے گئے گناہ لگتے ہیں عوامی رہنماؤں کی یادوں کو تازہ کیا جاتا ہے۔ اس کی نسبت قابل فخر بات ہو جاتی ہے آمر کے ساتھی مشکل وقت میں اسے اکیلا چھوڑ جاتے ہیں عوامی رہنماء پر کئی سر قربان کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں آمر کے ساتھی تو کیا اس کے ورثاء بھی اس کا حوالہ نہیں دیتے، عوامی رہنماء کے ساتھی اپنی وابستگیاں بیان کرتے ہوئے خوشی اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان کے ورثاء سرگرم ہوں تو عوام کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ خاموش ہوں تو قوم کی نظروں میں محترم مقام پاتے ہیں۔

بھٹو عوامی رہنماء تھے وہ آج بھی زندہ ہیں سارے ملک کی سیاست انہی کے نام کا طواف کر رہی ہے کئی حکومتیں آئیں ہیں ان کا نام مٹانے کے لیے لیکن نہیں مٹا سکے ان کے نام کو۔

www.bhutto.org

کل بھٹو صاحب خلق خدا کی محبتیں وصول کر رہے تھے آج ان کی سیاسی وارث محترمہ بینظیر بھٹو عوام کی عقیدتوں کی امین بنی ہوئی ہیں۔ محترمہ ہی آج شہید بھٹو کے قافلے کی قیادت کر رہی ہیں وہ ہر جدوجہد، جمہوریت اور وفاق پاکستان کی علامت ہیں۔

یہ مختصر سا پیش لفظ بھٹو صاحب کے مخالفت میں لکھی گئی کتابوں اور تحریروں پر تفصیلی تبصرہ ہے اور نہ ہی یہ چھوٹی سی کتاب "فکر بھٹو" قائد اعوام شہید ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی جدوجہد اور کارناموں کے مکمل تذکرے کا حق ادا کر سکتی ہے۔ میں نے تقریر کبھی لکھ کر نہیں کی لیکن اب جب پارٹی کی طرف سے اسٹڈی سرکل سندھ کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے تو پارٹی کے دوستوں، خاص طور پر ورکروں اور نوجوانوں سے پابندی سے بات چیت ہوتی ہے۔ ان دوستوں کے حکم پر ہی میں نے اپنی زبانی گفتگو کو تحریر کر کے مضامین کی صورت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ زبانی گفتگو کو جوں کا توں تحریر میں لانا ممکن نہیں تھا اس لیے اس گفتگو کو تحریر کا سلسلہ دینے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ ان مضامین میں بھٹو صاحب کی تحریروں اور تقریروں کے اقتباسات کو شامل کرنے کا مقصد نوجوانوں اور پارٹی کے کارکنوں کو بھٹو صاحب کے خیالات اور فکر سے روشناس کرانا ہے ان میں کئی اقتباسات کافی کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ پھر بھی ان کی اس کتاب میں موجودگی کئی دوسرے دوستوں کی معلومات اور فکری تربیت کا سبب ضرور بنے گی۔

میں اپنی قائد محترمہ بینظیر بھٹو کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے خالص علمی، نظریاتی اور بنیادی تنظیمی کام کے سلسلے میں مجھ پر اعتماد کیا۔ میں مرزا اکیڈمی بدین کے چیئرمین، ان کے دوستوں اور پیپلز پارٹی سندھ کی انفارمیشن سیکریٹری محترمہ ڈاکٹر فہمیدہ مرزا کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے یہ کتاب شائع کروانے کا ذمہ لیا

مولا بخش چانڈیو

قاسم آباد، حیدرآباد سندھ

www.bhutto.org

فکرِ قائدِ عوام

شعورِ انسانی کی ابتداء سے اب تک، تاریخِ انسانی کا کوئی بھی دور ظلم سے نفرت اور حق و صداقت سے پیار و عقیدت کرنے والوں سے خالی نہیں رہا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر باشعور انسان اپنے اپنے دور میں ہونے والے ظلم و بربریت کے خلاف نفرت، بیزاری اور حق پرست مظلوم سے پیار و عقیدت کا اظہار کرتا آیا ہے۔ یہ ہی سبب ہے کہ آج دنیا کو زہر کا پیالا پینے والا سقراط تو یاد ہے لیکن اس کو زہر پلانے والے ظالموں کو کوئی بھی یاد نہیں کرتا۔ آج دنیا میں ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور مصلوب عیسیٰؑ کے پیروکار تو لاکھوں کی تعداد میں ملیں گے، لیکن ان کی مخالفت کرنے والے ظالموں کے وارث ہونے کا مدعی کوئی ایک بھی دیکھنے کو نہیں ملتا۔

تاریخ شاہد ہے کہ ظالم و جابر یزید نے حضرت حسینؓ کو بے پناہ ظلم و بربریت سے کربلا کے میدان میں وقتی طور پر شکست دے کر ان کو اپنی راہ سے ہٹا تو لیا اور اس کا نام و نشان مٹانے کی سعی کی، لیکن اس ظلم و بربریت کے باوجود لوگوں کی محبت، عقیدت اور دائمی فتح حضرت حسینؓ کے حصے میں آئی اور لعنت و ملامت ظالم و جابر حاکم یزید کا مقدر بنی۔

تاریخ کا یہ سفر انسان کے ساتھ ساتھ جاری ہے۔ جب تک انسان ہے تب تک ظلمات اور روشنی، علم اور جہل، حق اور باطل کی اس محاذ آرائی کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ ان گنت انسان انہی سلسلوں پر چلتے ہوئے تاریخ میں اپنے انمٹ نشان چھوڑ کر جائیں گے۔ ایک کی یادیں تازہ رہیں گی اشکوں اور پھولوں میں تو دوسروں کی لعنت و ملامت میں۔

تاریخ کے سفر میں ہماری سرزمین کا ایک لائق فرزند بھی شامل ہے، جس کو وارثانِ ظلم نے حمایتِ حق کے جرم میں سولی پر چڑھایا۔ یہ فرزندِ سرزمین، جو کہ لاکھوں مظلوم انسانوں کے دلوں کی دھڑکن تھا، جو کہ ملک کا محافظ و پاسبان تھا، جو کہ امام علم و دانش تھا، جو کہ صاحبِ فہم

www.bhutto.org

وفراست تھا، جو کہ علمبردار امن عالم تھا، وہ تیسری دنیا کا تسلیم شدہ راہنما، ملک کا پہلا منتخب وزیراعظم، عالم اسلام کے مفادات کا محافظ، ''سر داد نہ داد دست در دست یزید'' کی سنت حسینی ادا کرنے والا ہمارا محبوب و مطلوب قائد عظیم، شہید جمہوریت ذوالفقار علی بھٹو ہے۔ جنہوں نے اپنے اصولوں کی خاطر سولی قبول کی لیکن ظالم کے آگے سرنگوں نہیں ہوا۔

اس عظیم انسان کے قتل پر بھی لاکھوں انسانوں نے احتجاج کیا، خود کو نذر آتش کیا، عمر رسیدہ، ادھیڑ عمر، نوجوانوں، عورتوں اور بچوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ دنیا کی مہذب قوموں نے قانون کے احترام اور رحم کے نام پر اپیلیں کیں، لیکن تاریخ! اپنے آپ کو دہرا رہی تھی اور ۲۰ ویں صدی کے تاراسیح کے دور نے دور قبل مسیح کی یاد تازہ کر دی۔ سبھی قانونی جواز، اپیلیں اور احتجاجوں کو پس پشت رکھ کر، انسان دوستی کی پاداش میں ایک عظیم انسان کے لہو سے دار کی خشک ٹہنی کو ہرا کیا گیا۔

تاریخ نے خود کو دہرایا، انسانوں کا پیار و عقیدت مظلوم کے حصے میں آیا۔ آج بھی باشعور اور انسان دوست حلقے ظلم سے نبرد آزما ہونے والے قائد شہید کے لئے اظہار عقیدت پیش کر رہے ہیں، اس کی تمناؤں کو تکمیل تک پہنچانے کا عہد کر رہے ہیں، اس کا بدلہ لینے کا وعدہ دے رہے ہیں۔

نثاران حقوق کیلئے عقیدت و احترام واجب ہے، لیکن صحیح معنوں میں ان کو خراج عقیدت پیش کرنا، ان کے فکر کی تکمیل ہے۔ حسینیت سے پیار یزیدیت کا خاتمہ ہے۔

اگر ہمیں بھی اپنے قائد کو خراج تحسین پیش کرنا ہے تو اس کی تمناؤں اور امنگوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ بھٹوازم کو سمجھنا اور نافذ کرنا ہے۔ اس فکر کی تکمیل ہی اس کے قتل کا بدلہ ہے۔ کیونکہ قائد شہید کو محض ایک فرد تصور کر کے کسی فرد نے قتل نہیں کیا، بلکہ قائد کو اس ملک کا ترقی پسند فکر اور ملک میں عوامی انقلاب کی ابتداء سمجھ کر، رجعت پسند قوتوں، سامراجی گماشتوں اور ایک ظالمانہ نظام نے قتل کیا ہے۔ چنانچہ اسی نظام ظالمانہ کا خاتمہ اور بھٹوازم کا قیام ہی قائد شہید کے قتل کا انتقام و بدلہ ہے۔

www.bhutto.org

بھٹوازم قائد شہید کی ایسی روشن خیال اور عظیم جدوجہد ہے جس میں ملک کی خوشحالی اور قوم کی آسودگی کا اسرار پنہاں ہے۔

بھٹوازم قائد عوام کا ایسا سیاسی طریقہ کار ہے، جس نے پسماندہ عوام کی زندگی کو شعور کی کرنوں سے منور کر کے، طاقت کے سرچشمے ہونے کا احساس دیا۔

بھٹوازم عوامی سیاست ہے۔ بھٹوازم محلاتی سازشوں کا خاتمہ ہے۔ بھٹوازم ایک ایسا سیاسی نظام ہے، جو کہ اقتصادی مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ بھٹوازم ملکی و غیر ملکی استحصالی قوتوں کے خلاف جدوجہد ہے۔ بھٹوازم ملکی حالات کے مطابق سوشلزم کی طرف قدم ہے، بھٹوازم مذہبی فرقہ واریت کے خلاف جہاد ہے۔

مطلب کہ بھٹوازم ملکی حالات کے مطابق ایسا سیاسی نظام ہے، جو کہ ملک کے سارے مسائل کے حل کی ضمانت دیتا ہے۔

ہماری بھٹوازم سے مراد اپنے محبوب قائد سے عقیدت و انسیت یا شخصیت پرستی ہرگز نہیں، بلکہ قائد عوام کا وہ انقلابی اصول ہے، جس کی خاطر اس کو سنت منصور ادا کرنی پڑی۔ اگر بھٹوازم محض ایک دور حکومت اور کچھ انتظامی غلطیاں ہوتا تو قائد عوام کو ہرگز شہید نہ کیا جاتا۔ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو ملک میں پہلے جدید انقلابی سیاسی دور کا بانی ہے۔

اس بات کا اعتراف پاکستانی سیاست کے لات مناتوں نے بارہا اپنی تقاریر میں کیا ہے۔ ان نام نہاد انقلابی رہنماؤں نے اعلانیہ قائد عوام کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ ''بھٹوازم'' لفظ کے خاتمے کا بھی مطالبہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ قائد عوام محض ایک شخص نہیں، بلکہ وہ ایسا انقلابی کارنامہ اور اصول ہے، جو کہ عوام کی زندگی میں تغیر پیدا کر کے قائد عوام کو امر بنا دے گا۔

جاننا چاہیے کہ بھٹوازم شخصیت پرستی ہرگز نہیں ہے، تو پھر بھٹوازم کیا ہے؟ بھٹوازم قائد عوام کے انقلابی اصول اور عوامی انداز سیاست ہے۔ قائد عوام کے انقلابی اصول اور انداز سیاست کو پرکھنے کے لئے ہمیں قائد کی سیاسی زندگی کو سمجھنا پڑے گا، قائد کے اسباب قتل کو جانچنا پڑے گا اور اس کے قاتلوں کو پہچاننا پڑے گا۔

www.bhutto.org

قائدعوام کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۵۷ء سے ہوا۔ جب اس نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی چھٹی کمیٹی میں خطاب کیا۔ پاکستان کے اس نوجوان نمائندے کی تقریر کا عنوان ''امن عالم اور جارحیت'' تھا، اور اس حوالے سے قائدعوام سیاسی زندگی کے آغاز سے ہی امن عالم کے لئے کوشاں تھا۔ وہ اپنی تقریر میں عالمی ضمیر جو جھنجھوڑ رہا تھا کہ امن عالم باتوں سے نہیں بلکہ بذریعہ ٹھوس اقدامات قائم کیا جاسکتا ہے۔

وہ کہہ رہا تھا: ''پاکستان ہر اس سعی و حرکت کو مسلح حملہ اور جارحیت قرار دیتا ہے جس سے ایک قوم سے دوسری قوم کو ایسا ہی جانی، مالی اور معاشی نقصان پہنچے، جیسا کہ کسی مسلح حملے یا جارحیت سے پہنچایا جاسکتا ہے۔ بظاہر یہ جارحیت نہیں لگتی، لیکن حقیقی معنی میں یہ جارحیت ہی ہے۔''

قائدعوام نے عالمی ضمیر کو اپیل کی:

''اپنی ذمہ داری سرانجام دینے اور جارح کو جارح اور مظلوم کو مظلوم قرار دینے میں کوئی رعایت نہ برتی جائے اور نہ ہی کسی خوف و خطرہ کا خیال رکھا جائے۔''

اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں قائد کو دوبارہ اقوام متحدہ میں ملک کی نمائندگی کے لئے بھیجا گیا۔ اس مرتبہ اس نے اقوام متحدہ میں پانچ خطابات دے کر عالمی مدبرین اور مقررین سے خوب داد و تحسین وصول کیا۔ عالمی مدبروں نے پاکستان کو لکھ بھیجا کہ ''اس نوجوان نے ملک کا فخر بلند کیا ہے۔''

قائدعوام واقف حالات، عالم، دانشور اور سچا نیشنلسٹ تھا وہ موقعہ ملتے ہی ملکی مفاد کا محافظ بن کر بین الاقوامی سامراجیوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ وہ ملک میں ایسی پالیسیاں وضع کرنے کا محرک بنا، جن کا مطلب سامراجی سازشوں کے سامنے دیوار کھڑی کرنا تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر وہ بیرونی دنیا میں سامراجیوں کے خلاف بین الاقوامی اتحاد قائم کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اس سوچ کے تحت قائد نے اپنی کوششوں کے بل بوتے پر دنیا کے عظیم ممالک و اقوام سے دوستانہ تعلقات استوار کئے۔ پاکستان اور سوویت یونین کے درمیاں

www.bhutto.org

طرح پانے والا معاہدہ بھی اس کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ سوویت یونین سے گہرے روابط قائم کرنے کے ساتھ، عظیم چین کی جانب بھی اس کا رویہ پیار و محبت پر مبنی تھا۔ چین کے ساتھ سرحدی معاہدہ بھی قائد کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ انڈونیشیا کے ساتھ مضبوط دوستی اور ایران اور ترکی کے ساتھ معاہدے قائد عوام کی ترقی پسند پالیسی کے ہی نتائج تھے۔

جہاں قائد عوام نے ملکی پالیسیوں کا رخ انقلابی رجحانات کی طرف موڑا، وہاں بین الاقوامی سطح پر سامراجیوں کے خلاف سرگرم عمل رہا۔ اقوام متحدہ میں عظیم چین کے ممبر ہونے کے حق میں پہلی مرتبہ قائد عوام نے آواز بلند کی اور کہا: ''چین کے ستر کروڑ عوام کو نظر انداز کر کے، عوامی جمہوریہ چین کو رکن بنائے بغیر اقوام متحدہ بین الاقوامی آزادی اور بنی نوع انساں کی خدمت اور خوشحالی کے لئے کوئی تعمیر پسندانہ قدم نہیں اٹھا سکتا۔''

قائد عوام کی خواہش غیر جانبدارانہ راہ تھی۔ اس کی منزل استحصال سے پاک، امن و آشتی سے لبریز ملکی و عالمی سماج تھا۔ اس نے کہا تھا:

''اقوام متحدہ کو بھی سامراجی اثرات اور سپر پاورز کے سلاسل باہمی سے آزاد کر دیا جائے اور اس سلسلے میں اقوام متحدہ کا مرکز نیویارک سے کسی غیر جانبدار ملک کی جانب منتقل کیا جائے۔''

اس نے پسماندہ اور استحصال زدہ براعظموں کے عوام کی حمایت کرتے ہوئے کہا:

''میں آپ (سلامتی کاؤنسل) سے معلوم کرنا چاہتا ہوں، کہ کیا یہ قانون فطرت ہے کہ ایفرو ایشیائی باشندے، پسماندہ، غیر تعلیم یافتہ اور مفلوک الحال رہیں، کیا یہ ہماری تحریر مقدر ہے کہ ہم بدحال رہیں؟ نہیں بالکل نہیں، ہم اس پسماندگی اور افلاس کا طوق اتار کر پھینکنا چاہتے ہیں اور ہم اپنے عوام کا مستقبل بہتر انداز سے تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اور یہ ہماری خواہش ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں عزت و اطمینان اور خوشحال زندگی بسر کریں۔''

علم التواریخ کا ماہر اور حالات عالم کا یہ نبض شناس گذرتے وقت کی تبدیلی کے ساتھ سامراجی ہتھکنڈوں میں تبدیلی سے بھی واقف تھا، اسے احساس تھا کہ: ''سامراجی غلامی

www.bhutto.org

کی جگہ سامراجی دخل اندازی نے لے لی ہے۔ شہنشاہیت کے روپ کے کلاسیکل وصف کی خاتمہ کے بعد صرف طریقہ استحصال تبدیل ہوا ہے۔ جیسے ہی سامراجی قوتیں اپنی نوآبادیوں سے لوٹیں، تو 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی بیکار پڑ گئی اور نئے زمانے کی چنگیز سے مدمقابل ہونے کیلئے اس کی جگہ 'ملاؤ اور حکومت کرو' پالیسی نے لے لی۔ اگرچہ مقصد وہی تھا۔''

شہنشاہیت کے خاتمے اور عالمی طاقتوں کے ارتقاء نے سپر پاورز کے تصور کو بدل دیا ہے۔ ان کے مفادات اب بنیادی طور پر عالمی نوعیت کے ہیں، ان کے توسیع کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا پر روایتی انداز میں قبضہ جمایا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں پر ضابطہ قائم کیا جائے اور ترقی پذیر ممالک کے لیڈروں کی تابعداری حاصل کی جائے اور وہ بھی دانستہ براہ راست مداخلت کے بجائے اقتصادی غلبہ اور دوسرے طریقوں سے۔''

جدید نوآبادیاتی دور میں کسی بھی عظیم طاقت کیلئے کسی علاقے پر عملی قبضہ لازمی نہیں ہے، کیونکہ اس کی عالمی پالیسی کے مفادات بلاواسطہ استحصال اور مختلف نوعیت کے حرص ولالچ کے ذریعے پورے ہو سکتے ہیں، مواصلات کے موجودہ ذرائع کی وجہ سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ کسی مستقل قبضے کے بغیر پوری دنیا کے عوام کی روزمرہ زندگی پر اپنا اختیار چلائیں اور اپنی ہدایات جاری کریں۔ اس جدید نظریاتی اور نوآبادیاتی غلبے کی ہوس کی وجہ سے بڑی طاقتیں دنیا کے ہر ایک حصے میں ایک خوفناک عالمی رقابت میں داخل ہو چکی ہیں۔''

قائد عوام کی سوچ عالمی سامراج سے چھوٹی قوموں کی آزادی سے تعبیر تھی:

''گذشتہ بیس برسوں کے اندر ان عالمی طاقتوں کا ظہور، حکومت چلانے والے طریقہ کار کے سارے نظریے کو بدل دیا ہے۔ وہ سب اقوام، جو کہ ترقی پذیر اقوام کے باب میں آتی ہیں، ان کیلئے بڑی طاقتوں سے تعلقات کا یقین کرنا اور قومی مفاد کو مقدم رکھنا بڑا پیچیدہ اور مشکل مسئلا بن گیا ہے۔ چھوٹی قوم، جو کہ حکمت عملی کے جدید طریقوں کو سمجھ نہیں پاتی، اس کے مقدر میں ناامیدی، احساس محرومی، تنہائی اور شاید انت میں مکمل تباہی لکھی جا چکی ہے۔''

قائد عوام نے اپنے اس سیاسی دور میں، اپنی ساری کاوش و کوشش، ملک کو

www.bhutto.org

غیر جانبدارانہ پالیسی دینے اور اس کو ترقی پسند راستے پر چلانے اور بین الاقوامی سامراج کے خلاف مظلوم اقوام کی متحدہ جدوجہد کے لئے وقف کی۔

قائد عوام تیز رفتاری سے اپنی انقلابی سوچ کے تحت جدوجہد کر رہا تھا اور اس جدوجہد کے نتیجے میں سامراج کو اپنی مخالف قوتوں کو متحد ہوتے نظر آ رہی تھیں، اس پورے عمل کو روکنے کیلئے سامراج نے قائد عوام کے خلاف سازش تیار کی اور اس سازش کے نتیجے میں قائد عوام کو وزارت خارجہ کے منصب سے الگ کیا گیا۔ قائد عوام کے خلاف کی گئی اس سامراجی سازش کو برطانیہ کے عالمی شہرت یافتہ مفکر برٹینڈ رسل نے اپنی طرف سے عالمی مدبرین کو تحریر کردہ خطوط میں بے نقاب کیا ہے۔

لارڈ برٹینڈ رسل نے برما کے جنرل نی ون کو ۱۳ اگست ۱۹۶۶ء کو خط میں تحریر کیا ہے کہ:

"۔۔۔۔ ذوالفقار علی بھٹو سے معلوم ہوا کہ آپ لندن میں تھے، وہ (بھٹو صاحب) آپ کو ایشیا کا عظیم لیڈر تسلیم کرتا ہے۔ اس کی رائے، میری اپنی رائے کیلئے تقویت کا باعث بنی ہے۔ اگر آپ سے ملاقات ممکن ہو سکے اور کچھ اہم موضوعات پر گفتگو کا موقعہ ملے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ نکرومہ، صدر سوئیکارنو اور ذوالفقار علی بھٹو جیسے سچے قوم پرست اور ترقی پسند رہنماؤں پر امریکی دباؤ پر مجھے سخت تشویش ہے۔"

اخبار سپکٹیٹر کے ایڈیٹر کو تحریر کردہ اپنے خط میں لارڈ برٹینڈ رسل نے کہا کہ: "حالیہ تبدیلیوں کا ادراک رکھنے والے اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں کہ مغرب کی مفاد پرستانہ سیاست، عوام کی خواہشات سے ہم آہنگ رہنماؤں کو اپنے انتقام کا نشانہ اول بنانا چاہتی ہے۔ یہ رہنما ایفرو ایشیائی استحکام اور خود مختیارانہ ترقی کی پالیسی کے خالق ہیں۔ اس سلسلے میں نئے نئے حربے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر گھانا میں نکرومہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کیلئے ڈرامے رچائے جا رہے ہیں۔ انڈونیشیا میں بائیں بازو کے فرضی انقلاب کے اندیشے کی ہوا کھڑی کر کے دائیں بازو کی فوجی بغاوت کو جواز فراہم کیا گیا۔ اسی طرح پاکستان میں ایسی

www.bhutto.org

شخصیت، جسے خودمختیار خارجہ پالیسی کا معمار مانا جاتا ہے، کو وزارت سے الگ کر دیا گیا۔۔۔۔ بھٹو صاحب وہ پہلا لیڈر تھا، جس نے نہرسویز کے مشرق میں تیار کی جانے والی سامراجی پالیسیوں کو بے نقاب کیا اور ہر موقعہ پر ان کے خلاف نفرت وحقارت سے بھرپور تقاریر کیں۔۔۔۔ پردے کے پیچھے کی جانے والی امریکی سازشوں کے تحت اسے اقتدار سے علحدہ کیا گیا ہے۔ بہرحال ذوالفقارعلی بھٹو کا اس طرح حکومت سے الگ ہونا، اس ملک کے مستقبل کیلئے عظیم خطرہ ہے۔"

لارڈ نے صدر ناصر کو لکھا کہ: "میں امریکا کی ان کوششوں کو سخت تشویش سے دیکھتا ہوں، جو کہ ایسے رہنماؤں کو تباہ کرنے کیلئے کی گئی ہیں، جو کہ غیر ملکی قزاقوں اور مغربی ممالک کے دباؤ کے خلاف مزاحمت کر کے اپنے عوام کے مفادات کو آگے لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ بخوبی واقف ہیں کہ گھانا اور انڈونیشیا میں بھی یہ سازشیں ہو چکی ہیں اور اگر پوری طرح باخبر نہ ہوتے تو، یہی کچھ متحدہ عرب جمہوریہ میں ہو چکا ہوتا۔"

"حال ہی میں امریکہ اور برطانیہ نے ذوالفقارعلی بھٹو کو وزارت خارجہ سے الگ کرنے کیلئے زبردست دباؤ سے کام لیا۔ بے شک مسٹر بھٹو پاکستان کی آزادانہ خارجہ پالیسی کے معمار ہیں۔ مسٹر بھٹو نے ہی تن تنہا ایفروایشیائی استحکام کیلئے جدوجہد کی اور متحدہ عرب جمہوریہ سے تعلقات میں اضافے کیلئے بے پناہ خطرہ مول لیا۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے واقعات ایسا رخ اختیار کریں گے کہ مسٹر بھٹو دوبارہ اقتدار پر آ جائیں گے۔"

الجزائر کے صدر بومدین کو لکھے گئے خط میں کہا گیا ہے کہ: "حال ہی میں پاکستان میں بھی اسی قسم کی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ میری مراد مسٹر ذوالفقارعلی بھٹو کی حکومت سے علحدگی ہے، جو کہ آزادانہ خارجہ پالیسی اور ایفروایشیائی استحکام کا معمار تھا۔ اس نے پاکستان کو نوآبادیاتی ممالک کی صف سے نکال کر ایشیا و افریقہ کے ان ممالک کی قطار میں لا کھڑا کیا جو کہ آزادانہ پالیسی پر بالکل واضح ہیں۔"

"میں ذاتی طور پر باخبر ہوں کہ الجزائر اور پاکستان کو قریب لانے میں مسٹر بھٹو نے

www.bhutto.org

اہم اقدامات اٹھائے ہیں---- پاکستان کی آزادی و خودمختیاری کیلئے اس کا اصولی موقف اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ دوبارہ اقتدار پر واپس آ جائے گا۔"

انڈونیشیا کے رہنما سوئیکارنو کو لکھا گیا کہ: "قومی وقار اور ترقی کیلئے آپ اور ایفروایشیائی عوام کیلئے ایسی خصوصیات ناگزیر ہیں، جیسے ذوالفقار علی بھٹو نئی تبدیلیوں کا رہنما ہے۔"

روسی رہنما گرومیکو کو تحریر کیا گیا کہ: "میں بڑی تشویش کے ساتھ اس دباؤ کا جائزہ لے رہا ہوں جو کہ امریکہ کی جانب سے ایسے قوم پرست رہنماؤں پر ڈالا جا رہا ہے، جو کہ اپنی قومی آزادی اور ملک کے حقیقی مفادات کیلئے کام کرتے ہیں اور ایسا دباؤ صدر نکرومہ اور پیٹرس لومبا پر ڈالا گیا، بالکل اسی طرح پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو وزارت خارجہ سے الگ کیا گیا۔ میں جانتا ہوں کہ مسٹر بھٹو پاکستان کی آزادانہ خارجہ پالیسی اور ۱۹۶۰ء کے پاک-سوویت آئل معاہدہ کا خالق ہے۔ پاکستان اور سوویت یونین کے درمیاں دوستانہ تعلقات کیلئے مسٹر بھٹو کی پیش عملی نہایت اہم قدم ہے، جس کی وجہ سے پاکستان امریکی پالیسیوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔"

چینی رہنماؤں کو لکھا گیا کہ: "مجھے امید ہے کہ یہ آپ کیلئے ممکن ہوگا کہ سیاسی طور پر ذوالفقار علی بھٹو کی مدد جاری رکھ سکیں۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو ہی تھا جس نے چین سے دوستانہ تعلقات اور ترقی پسند انسانیت کے مقصد کو بڑھاوا دینے والی پالیسی اختیار کی۔ اس نے چین کے ساتھ دوستانہ پالیسی مرتب کی۔ اپنے مفادات کے خاطر امریکی مفادات کی خدمت انجام دینے والوں نے اس پالیسی کی سخت مخالفت کی۔ (آگے چل کر) پاکستان کے حالات ایسا رخ اختیار کریں گے کہ ذوالفقار علی بھٹو دوبارہ برسر اقتدار ہونگے۔"

سامراجی سازش وقتی طور پر کامیاب ہوئی۔ شہید بھٹو کو اقتدار سے الگ کیا گیا۔ سچ اور حق، بے پناہ ظلم کے باوجود بھی پہلے سے بڑھ کر واضح طور پر ابھر آتا ہے۔ سچا انقلابی تشدد سے بزدل نہیں ہوتا، بلکہ تشدد اسے ایک نیا حوصلہ اور جوش عطا کرتا ہے۔ ویسے بھی بحرانی

www.bhutto.org

حالات غیر معمولی انسانوں کی صلاحیتوں کو اور زیادہ اجاگر کرتے ہیں۔ ملکی بحرانوں میں سے ہی ملک وقوم کی حقیقی قیادتیں پیدا ہوتی ہیں۔

پاکستان میں بھی اس سامراجی سازش نے آنے والے انقلاب کی قیادت کو نروار کر دیا۔ فکر قائد کے واضح اظہار کا بھی زمانہ یہی ہے۔ جبکہ قائد عوام نے ملکی فرائض اور حکومتی مصلحتوں سے آزاد ہو کر اپنے تصورات، خیالات اور خواہشات کا اعلانیہ اظہار کیا۔ قائد عوام ملک کے کونے کونے میں جا کر عوام کے عظیم الشان اجتماعات میں قوم کی آزادی و خود مختیاری کا درس دے رہے تھے۔ قائد عوام کے اعلانات میں قوم کیلئے خوشخبری تھی۔ زندگی پانے کی صدا تھی۔ قائد عوام ہر ایک خوف و ہراس سے آزاد ہو کر قوم کی مسیحائی کر رہے تھے:

''میں اپنے خیالات اور نظریات کو کچھ دنوں کیلئے اقتدار پر قربان تو نہیں کر سکتا''،

''اقتدار آنی جانی چیز ہے، اقتدار ہمیشہ کسی کی ملکیت نہیں رہا ہے، سکندر، فرعون، چنگیز خان اور ہٹلر جیسے حکمرانوں کا اقتدار ختم ہو گیا۔ جو چیز ہمیشہ رہے گی اور جو غیر فانی ہے، وہ ہے کس نے کیا کیا، کس نے عوام کی خدمت کی اور کس نے عدل و انصاف کیا۔ کس نے قوم پرستی کی، کس نے اپنا سب کچھ عوام کیلئے قربان کر دیا۔ تاریخ کبھی کسی ظالم کو خراج تحسین پیش نہیں کرتی اور نہ کسی مظلوم نے انسانیت دوست کی قربانی کو نظر انداز کیا ہے۔''

''میں رنگ، نسل اور علاقائیت کا قائل نہیں ہوں، میں انگریزوں کے اس فلسفہ فرسودہ سے انکاری ہوں کہ رنگ و نسل اور علاقے کی بنیاد پر کوئی قوم چھوٹی یا بڑی ہوتی ہے، یا بزدل یا بہادر ہوتی ہے۔ میرے نزدیک سبھی انسان برابر ہیں۔ خواہ کوئی کالا افریقی ہو کہ چینی جاپانی، چھوٹے قد والا ویتنامی ہو کہ لمبا امریکی۔ یہ سوچ میرا نظریہ حیات ہے۔ آپ مجھے سندھی اور غیر سندھی بنیادوں پر ڈرانے کی کوشش مت کریں۔ آپ ابھی تک ریگستانی عوام سے ناواقف ہیں، آپ کو حق نہیں پہنچتا کہ آپ سندھی عوام کو بزدل کہیں۔''

''میں عوامی مسائل پر امن اور جمہوری طریقے سے حل کرنے کا قائل ہوں، اگر آپ جمہوریت کی زبان نہیں سمجھتے تو عوام اپنا حق حاصل کرنے کیلئے کون سا طریقہ اختیار

www.bhutto.org

کرے؟ ضرورت پڑنے پر سب سے پہلے میں ہی میدان میں اتروں گا۔ ہم انقلاب سے نہیں ڈرتے، ہم خون خرابے سے نہیں کانپتے۔"

قائد عوام کا یہ فرمان تو اس کی فکر کی واضح اور صاف تصویر ہے کہ: "جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے، ہر کوئی حکومت وحدت قومی کیلئے اپیلیں کرتی آئی ہے۔ پاکستان کے بعد دیگرے مختلف بحرانوں میں سے گذرتا رہا ہے اور تمام تر دلسوز اپیلوں کے باوجود وحدت قومی ہم سے دور رہتی آئی ہے۔ ان باتوں کے ضرور کچھ مضبوط اسباب ہو سکتے ہیں کہ کیوں ہمارے ہاں بجائے وحدت قومی، بحرانوں کی یلغار ہوتی رہی ہے۔ ان اسباب کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک کو دو اقسام کے بحران درپیش ہیں۔ ایک عمومی قسم کا بحران کہ جس نے ساری دنیا، بالخصوص ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ دوسرے بحرانات وہ ہیں کہ جن کے سائے برصغیر ہندو پاک پر لہرا رہے ہیں۔

ان دونوں بحرانوں میں بڑا واضح تعلق ہے۔ بحرانوں کی نوعیت کوئی بھی ہو، خواہ سادہ ہوں یہ پیچیدہ، ضروری ہے کہ حالات کا صحیح اندازہ لگایا جائے۔ جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں وہ ایک ایسے موڑ کی جانب بڑھ رہی ہے، کہ جو عالمی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔

ہم ایک عمودی چٹان کے کنارے کھڑے ہیں، جس کے پیچھے موت کی وادی ہے۔ کیا ہمیں دانستہ تباہی سے ہم کنار ہونا چاہیے یا پیچھے ہٹنا چاہیے، جبکہ پیچھے ہٹنے کے سوائے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس عمل سے ہماری عزت نفس کو کوئی دھچکا نہیں لگتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ حسین دنیا خواہ مخواہ کی تباہی سے بچ جائے گی۔

یہ اصرار کرنا بے معنی ہے کہ بحران آج کے دور کی تقاضا ہے اور ہمارے اس مضطرب دور کا فطری مظہر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو شیطانی رجحانات کارفرما ہیں ان کے بہاؤ کا رخ بدلا جائے۔ یہ صرف ہمارا ملک ہی نہیں، جو کہ بحران میں گرفتار ہے، لیکن بہت سارے ممالک ایسے ہیں جنہوں نے ہم سے مماثل مسائل کے حل میں کامیابی حاصل کی ہے اور اب وہ قوت حاصل کرنے کے بعد دوسرے مسائل کے حل کی سمت گامزن ہیں۔ آگے

www.bhutto.org

بڑھنے کی قوت داخلی مسائل کے حل سے حاصل ہوتی ہے۔

بہت سارے ممالک کے برعکس بدقسمتی سے پاکستان ہنوز اپنے بہت سارے بنیادی داخلی مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں کہ جن کا اثر عوام، ان کے مقدر، ان کی اولاد کی زندگی اور معاشرے پر مستقبل میں پڑے گا۔ جن مسائل کا تعلق عوام اور ان کی امنگوں سے ہے، سچ یہ ہے کہ آج تک ان کو پیش نظر رکھا نہیں گیا ہے۔

جب تک ملک کا عوام اپنے مستقبل کا آزادانہ فیصلہ نہیں کرتا تب تک ہماری مشکل کا خاتمہ مشکل ہے۔ موجودہ جمود کو محض ہتھکنڈوں سے توڑا نہیں جاسکتا، آگے کی طرف قدم، پچھلی غلطیوں کے بوجھ سے آزاد ہونے کے بعد ہی اٹھایا جاسکتا ہے۔

انتشار کے گرد و غبار میں ایک راہ کے نشانات واضح ہیں۔ عوام کی ایک بڑی تعداد، جس میں نئی نسل سرفہرست ہے، اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ پاکستان کے مسائل حل کرنے کیلئے پرانے طور طریقے ہمارے مددگار ثابت نہیں ہوسکتے۔

ہر دور کی اپنی سیاسی معنویت ہوتی ہے۔ آج کے جوشیلے اور للکارنے والے دور کی تقاضا ہے کہ پاکستان کی مجموعی آبادی کی بہترین خواہش کے مطابق معاشرے کی تعمیر کیلئے ایک بالکل نئی راہ تلاش کی جائے۔ ہم ماضی کی طرف لوٹنے کیلئے تیار نہیں ہیں، نہ ہی عوام موجودہ دور کو زیادہ برداشت کرنے کو تیار ہے۔

داخلی اختلافات کو باہمی رضامندی اور بات چیت سے حل کرنا لازم ہے۔ آزادئ ضمیر کے اس دور میں عوام کی دانشمندی پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے آزاد اداروں کی ضرورت ہے، کہ جو اپنے خالقوں کے بعد بھی زندہ رہ سکیں۔ قانون کو عمل میں اس طرح آنا چاہیے کہ وہ عوام کے ہاتھ میں تلوار نہ بن جائے اور نہ ہی غیر منصفانہ صورتحال کی ڈھال۔"

قائد عوام پاکستان کے حالات کے مطابق انقلابی تبدیلیاں لانے کا خواہشمند تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ملک میں سوشلزم رائج ہو۔ ملکی عوام ظلم و جبر سے آزاد زندگی بسر کرے۔ عوام ملک کے حقیقی مالک و مختار ہوں:

www.bhutto.org

"موجودہ حالات کے بجائے ایک ایسے جمہوری اختیارات کے دور کا آغاز ہو، کہ جس میں پوری آبادی شریک ہو، نہ صرف شریک ہو بلکہ اس کو بااختیار ہونے کا بھی احساس ہو اور وہ اس بات پر فخر بھی کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ بنیادی حقوق کو بحال کیا جائے اور عوام کو ایک ایسے برابر معاشرے کے قیام کیلئے اکسایا جائے جو کہ عوام کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ ساری طاقت عوام کو منتقل کی جائے، یہ عمل صرف جمہوریت سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔"

جمہوریت ضرورت ہے، مگر آخری منزل نہیں۔ جمہوریت کی جدوجہد میں اقتصادی مقاصد کو ہرگز نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، جو کہ اول حیثیت کے حامل ہیں۔ اقتصادی ترقی کے بغیر کوئی بھی قوم کھوکھلی جمہوریت سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ جمہوری آزادی ضروری ہے، مگر اقتصادی مساوات وانصاف زیادہ ضروری ہیں۔ اقتصادی تبدیلیوں کے بغیر قومی زندگی میں کوئی خاص روشن تبدیلی نہیں آ سکتی۔ اگر عوام کی غلامی کے خاتمے کی خواہش ہے، تو جمہوریت کے ساتھ ساتھ کشادہ دل سوشلزم بھی ضروری ہے۔

اس غریب ملک کے محدود ذرائع کو ضائع کیا جا رہا ہے اور بین الاقوامی منڈی میں خام مال کی قیمتوں کی وجہ سے صنعتی ممالک سے ضروری سامان درآمد کرنے کی صلاحیت کم ہو رہی ہے۔ ایسی صورتحال میں ہمارے اقتصادی مسائل کا واحد حل سوشلزم ہے۔

سوشلزم ہی استحصال کے خاتمے اور وحدت کے فروغ کا واحد ذریعہ ہے۔ جب تک استحصال ختم نہ ہوگا، تب تک وحدت صرف ایک نعرے کے سوائے کچھ بھی نہیں ہے۔ سوشلزم ہی سب کیلئے برابر مواقع کی فراہمی سے استحصال سے بچاتا ہے۔ طبقاتی فرق کی دیواروں کو گرا کر اور اقتصادی وسماجی انصاف کو قائم کر سکتا ہے۔ سوشلزم جمہوریت کا اعلیٰ ترین اظہار ہے۔

سوائے ان ممالک کہ جو انقلاب کی بھٹی میں سے گذرے ہیں، کئی ایسے ممالک ہیں کہ جن میں دستوری شہنشاہیت قائم ہے، جہاں تشدد آمیز تبدیلیوں کے بغیر سوشلسٹ تقاضوں کو بتدریج پورا کیا گیا ہے۔

www.bhutto.org

سوشلزم کا اصول بنیادی طرح دو باتوں پر انحصار کرتا ہے۔ اول، جدید سوشلزم کی بنیاد معروضی ہے، دوم، سوشلسٹ طرز فکر دنیا کے ہر ایک خطے کے ملک کے رائج اقتصادی و سیاسی حالات سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ اس اعتبار سے سوشلزم پاکستان کی توجہ براہ راست طلب کرتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں داخلی و خارجی استحصال کا دور ہے، بذریعہ سوشلزم اس داغ کو دھونا پڑے گا۔ پہلا قدم یہ اٹھانا پڑے گا کہ غاصبانہ سرمایہ داری کو ختم کیا جائے اور سوشلزم نافذ کیا جائے۔ ذرائع پیداوار جو کہ صنعتی ترقی کو جنم دیتے ہیں، یا جن پر صنعتوں کا انحصار ہے، انہیں نجی ملکیت میں ہرگز نہیں دیا جائے گا۔

سب کاروبار جو کہ قومی معیشت کے اوپری ڈھانچے کی تشکیل کرتے ہیں، لازمی طور پر عوامی ملکیت میں لینا چاہیے۔ بنیادی ذرائع پیداوار اور متبادل پر عوامی اختیار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نجی شعبوں کو ختم کیا جائے، نجی کاروبار کو اپنا مفید کردار ادا کرنے کی اجازت ہوگی مگر وہ اجارہ دار طبقے ذخیرہ اندوزی کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ نجی شعبے کو ان حالات میں نشوونما کی اجازت ہوگی، جو کہ نجی شعبے کو زیب دیتے ہیں۔

ایک جگہ کے حالات دوسری سے مختلف ہوتے ہیں، پاکستان میں سوشلزم نافذ ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اس کے نظریہ حیات سے ہم آہنگ ہو اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے جمہوری بھی ہو اور کسی بھی طرح بیرونی مداخلت کا سوال پیدا نہ ہوتا ہو۔"

"اگر سوشلزم کی اسکینڈی نوین قسم ہو سکتی ہے تو کوئی پاکستانی قسم بھی مل سکتی ہے جو کہ ہمارے حالات کے مطابق ہو۔"

"اسلام اور سوشلزم کے اصول ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوتے، اسلام مساوات کی تعلیم دیتا ہے اور سوشلزم مساوات کو حاصل کرنے کا جدید طریقہ ہے۔ اسلام ہمارا مذہب ہے، وہ پاکستان کی بنیاد ہے۔ سوشلسٹ طرز حکومت ایسی سبقت کا رقیب نہیں ہے لیکن اس کے برعکس سوشلزم پوری قوم کو اسلامی اقدار کی محافظ بنا دے گی۔"

"میرا ایمان ہے کہ اگر اقتصادی و سماجی انصاف کے راستے کو نظر انداز کیا گیا تو نہ

www.bhutto.org

صرف پاکستان کی سالمیت کو خطرہ درپیش ہے، بلکہ اس کا ٹوٹ کر بکھرنا بھی یقینی ہے۔"

قائدعوام پورے ملک کے کونے کونے میں جا کر قوم کو نئی زندگی کا پیغام دیتا رہا اور ملک میں ظلم و استبداد سے پاک امن و آشتی سے لبریز سماج کے قیام کی جدوجہد کے لئے پکارتا رہا اور قوم کو بھی قائدعوام کی صورت میں اپنا نجات دہندہ نظر آیا۔ پوری قوم نے اس کی طرف سے بلند کی ہوئی زندگی کی صدا پر لبیک کہا، عمر رسیدہ، اڈھیڑ عمر، بچے، عورتیں، طلباء، کسان اور مزدور وغیرہ قائدعوام کی قافلے میں شریک ہو گئے۔ ملک میں انتخابات ہوئے اور ملک کے عاقبت نااندیش، ہوس اقتدار میں مبتلا اندھے جنرلوں اور سرمایہ داروں کی مفاد پرستانہ پالیسی کی وجہ سے ملک کا ایک حصہ علحدہ ہو کہ آزاد بنگلہ دیش بن گیا تو باقی ماندہ پاکستان کی سلامتی کا کسی کو یقین نہ تھا اور بالآخر ظالم حکمرانوں نے شکست قبول کی اور انہیں قائدعوام کے سوائے کوئی دوسرا رہنما نظر نہ آیا کہ جو اس تباہ حال ملک کو بچائے اور اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے۔ ملکی حاکمیت کی باگیں قائدعوام کے سپرد کی گئیں۔

قائدعوام کو جدوجہد کے دوران کن کن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور کون کون سے حالات میں حکومت کی باگیں سنبھالنی پڑیں اور کس طرح اس تباہ حال ملک کو دوبارہ تعمیر کیا یہ تفصیلات ایک مکمل تاریخ ہے۔

قائدعوام حکومت سنبھالنے کے بعد بغیر تاخیر اس ڈوبتی کشتی کو کنارے سے لگانے کی تگ و دو میں مصروف ہو گیا۔ ملکی معیشت تباہ ہو چکی تھی۔ ملک کے ۹۰ ہزار جنگی قیدی بھارت میں مقید تھے۔ پورا ملک بحران کا شکار تھا اور سب سے قابل ذکر بات یہ کہ پوری قوم مایوسی میں مبتلا تھی۔

قائدعوام نے بڑی جستجو کی۔ ساری دنیا میں پاکستان کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ بحال کیا۔ خارجہ پالیسی کو آزادانہ راہ پر لایا۔ ملکی معیشت کی دوبارہ بحالی کیلئے فوری اقدامات عمل میں لائے گئے۔ قائدعوام کو جن حالات میں ملک سپرد کیا گیا تھا، ان حالات میں قائدعوام اپنی پارٹی اور اس کی تنظیم پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ اس کے نزدیک بقائے ملک و قوم کو

www.bhutto.org

اولیت حاصل تھی۔ باوجود اس کے کہ قائدعوام ملکی مسائل میں گھرے ہوئے تھے ان کو عوام کو دیئے گئے اپنے وعدے یاد تھے۔ عوام کی حقیقی آزادی و خوشحالی پر سے اس کی توجہ منتشر نہ ہوسکی۔ اس نے عوام کی ترقی کیلئے بنیادی اقدامات کئے، ملک کے بینک، انشورنس کمپنیاں اور سبھی بڑی مالیت کی صنعتیں قومی ملکیت میں لی گئیں۔ بذریعہ زرعی اصطلاحات کسانوں کے حقوق کیلئے قوانین وضع کیے گئے۔ مزدوروں کی خوشحالی کیلئے اصطلاحات کا اعلان کیا گیا۔ تعلیمی اصطلاحات عمل میں لائے گئے، تعلیم کی فروخت کو ختم کر کے ہر شہری کیلئے حصول تعلیم کے بہتر اقدامات کئے گئے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اضافہ کیا گیا۔ مطلب کہ زندگی کے ہر شعبے میں انقلابی تبدیلیاں برپا کرنے والے اقدامات کئے گئے۔ ملکی حالات کی وجہ سے بے شک وہ نہ ہوسکا جو قائدعوام نے چاہا تھا، پھر بھی قائدعوام کے دور کو انقلابی، سیاسی اور مساواتی معاشرے کے قیام کی جانب ایک اہم پیش رفت ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ جو اقدامات قائدعوام نے عوام کے فلاح و بہبود کیلئے اٹھائے ان میں سے جتنا فائدہ ہونا چاہیے تھا، اتنا قائدعوام کے پاس بہترین ٹیم میسر نہ ہونے کے سبب حاصل نہ ہوسکا۔ اس میں قائد کی کوئی کوتاہی نہیں ہے، چونکہ پاکستان پیپلز پارٹی اپنے قیام کے مختصر عرصے کے بعد تباہ حال ملک کے اقتدار کی مالک بنی، اس لئے کارکنوں کی صحیح معنوں میں ویسی تربیت نہ ہوسکی جو کہ ہر کارکنان انقلابی پارٹی کیلئے لازم ہوتی ہے۔ اس جماعت نے جب افسر شاہی اور ظالمانہ وڈیرہ شاہی کے خلاف جدوجہد کا اعلان کیا اور حکومت نے بھی انقلابی اقدام اٹھانے شروع کئے تو اس جماعت کے پاس ویسی موثر اور تربیت یافتہ ٹیم موجود نہ تھی، جو کہ افسر شاہی اور وڈیرہ شاہی کی سازشوں کیلئے زنجیر بن سکے۔

قائدعوام کا دور حکومت، فکر قائدعوام کی مکمل تعبیر تو نہیں تھا، پھر بھی قائدعوام نے اپنے مختصر دور میں ملک کے ہر ایک گوشے میں اپنی یادیں چھوڑی ہیں۔ ہر ایک شعبہ ہائے حیات میں اس کی انقلابی خواہشوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ فکر قائدعوام، قائدعوام کی انقلابی جدوجہد ہے، وہ عوامی فلاح و بہبود کا پروگرام ہے۔ قائدعوام کی سنہری یادیں باقی ہیں۔ قائد

www.bhutto.org

عوام کے دور حکومت کی چند انتظامی غلطیوں یا چند شخصیات کی غلط پالیسیوں پر کی جانے والی تنقید کی وجہ سے فکر قائد کو عوام کیلئے منفی قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی فکر قائد عوام کو ذاتی بغض کے سبب محض شخصیت پرستی قرار دے کر اس سے انکار کیا جاسکتا ہے۔

فکر قائد عوام کو محض قائد عوام کے نام سے منسوب ہونے کے سبب شخصیت پرستی قرار دینا درست نہیں ہے۔ سبھی افکار اپنی بانیوں اور نافذ کرنے والوں کے نام سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔

ہمارے ایمان کے رو سے اسلام خدا کا دین اور نظریہ ہے اور اس کا نام اسلام ہی ہے، لیکن مولوی اور علماء نفاذ اسلام کے مطالبے کے وقت نظام مصطفیٰ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کمیونزم کو مارکسزم بھی کہا جاتا ہے اور اسی نظریے کو چین میں ماؤازم بھی کہا جاتا ہے۔ آج بہت سارے ایسے ممالک ہیں جہاں پر قومی آزادی کیلئے اور استحصال کے خلاف ہونے والی جدوجہد کو اپنے عظیم قائدین سے منسوب کیا گیا ہے۔ اور عظیم رہبران کے نام سے جدوجہد کی منسوبیت ہرگز شخصیت پرستی نہیں ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عوامی سیاسی کی بنیاد رکھنے والے، ملکی لٹیروں کے خلاف عملی جدوجہد کرنے والے، بین الاقوامی سامراج کے خلاف جنگ لڑنے والے، مذہبی فرقہ وارانہ جنون کے خلاف آواز بلند کرنے والے، عوام کو طاقت کا سرچشمہ قرار دے کر انہیں اپنے حقیقی طاقتور وجود کا احساس دلانے والے، اجارہ داریوں کا انت چاہنے والے، انسانیت کی سربلندی اور انسان کی حقیقی آزادی چاہنے والے، ملک کی حقیقی خودمختیاری اور غیر جانبداری کے خالق، آسمان سیاست کے چودھویں کے چاند، کہ جس نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے قوم کو جدوجہد کا صحیح راستہ دکھایا، اس کے ان اعلیٰ آدرشوں کی تکمیل اور اس کے خوابوں کی تعبیر کیلئے سماج میں ہونے والی جدوجہد کو اسی کے نام سے منسوب کرنا شخصیت پرستی ہرگز نہیں ہے۔

فکر قائد عوام شخصیت پرستی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان کی اصول پرستی ہے۔ فکر قائد عوام شخصیت پرستی ہوتا تو انسان دشمن طبقات، جنہوں نے ہمیشہ حکمرانوں کے آگے دُم ہلکانے

www.bhutto.org

والا کردار ادا کیا ہے یا وہ کہ جن کا کام ہی حاکم کے ظلم کو نام نہاد مذہب کے چوغے میں ڈھانپنا ہے، جنہوں نے ہمیشہ دولت پر دین بیچ کر دین کی سوداگری کی ہے، وہ قائد عوام کی زندگی میں ہی، اس کے خلاف فتوائیں نہ دیتے اور نہ ہی ہریالی کے سانڈ، اپنے ملکی و غیر ملکی آقاؤں کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر فکر قائد کو ختم کرنے کے لئے ہانپتے اور سازشیں کرتے پھرتے۔ یہ سبھی ظلم کی پشت پناہی کرنے والے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ قائد عوام ایک ایسی جدوجہد کا آغاز کر کے اسے پایہ تکمیل تک پہنچا رہا ہے، جس سے ان کے غیر ملکی آقاؤں کے وجود کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ان کی مفاد پرستی کا بھی انت آن پہنچے گا اور عوام کا استحصال نہ ہو سکے گا، اس طرح وہ آئندہ عوام کا خون چوسنے جیسی عیاشی نہ کر سکیں گے، ان کی اجارہ داریاں اپنے موت آپ مر جائیں گی اور اس کے ساتھ انہیں اپنے سبھی محافظ اداروں کا وجود بھی خطرے میں نظر آنے لگا۔

قائد عوام کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں۔ وہ سازش طبع لوگ جہاں بھی بیٹھے وہاں پر ہائے ہائے کرنے لگے کہ: ''بھٹو دور میں شریفوں کے ساتھ بڑا ظلم ہو رہا ہے، کوڑی کے آدمیوں کو عزت دے دی گئی ہے، جن کو کل تک کوئی پوچھتا نہیں تھا، وہ بھی آج لیڈر بنے پھرتے ہیں اور عزتداروں کی بے عزتی کر رہے ہیں۔ بھٹو نے مزدوروں کا دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے، طلباء تو باؤلے ہو گئے ہیں اور کسان تو آپے سے نکلے جا رہے ہیں۔ بس جیئے بھٹو جیئے بھٹو کی رٹ لگائے زمیں آسماں ایک کئے پھرتے ہیں۔''

یہ باتیں ان ظالموں کے بغض اور عناد کی عکاسی کرتی ہیں، جو کہ قائد عوام سے ان کی نفرت کا اظہار ہیں اور ان باتوں سے یہ بات صاف صاف سمجھ میں آ رہی تھی کہ بھٹو صاحب کے ساتھ ان کی مخالفت کا یہ ہی ایک سبب تھا کہ ان کے نام نہاد خاندانوں کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ وہ اس ڈر میں مبتلا تھے کہ آنے والے وقت میں عام لوگوں کو اپنے حکم کا غلام بنا کر نہ رکھ سکیں گے۔

تاریخ انقلابات عالم شاہد ہے کہ جہاں کہیں بھی کمزور اور محکوم لوگوں نے اپنے اتحاد

www.bhutto.org

سے حاکم اور ظالم طبقوں پر فتح حاصل کی اور ان کے ساتھ اپنا حساب برابر کرنا چاہا تو یہی لوگ کمزوروں کے خلاف ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے نظر آئے۔ چین میں کسانوں کی بغاوت کے دوران وہاں کے ظالم حکمران کی جانب سے بھی یہی کہا گیا کہ ماؤ نے لوگوں کا دماغ خراب کر دیا ہے اور کسان عزتداروں کو بے عزت کر رہے ہیں۔

یہ ظالم بھی سازشوں میں شریک تھے، تو ان کے محافظ دین فروش مُلا بھی ان کی معاون بن کر کھڑے ہو گئے، کیونکہ مُلا حضرات بھی جانتے تھے کہ فکر قائد عوام کی وجہ سے ان کی منافقت کی دوکان بند ہو جائے گی، ان کی پاپائیت بھی اختتام پذیر ہو گی۔ انہیں اسلام سے کوئی سروکار نہ تھا، ورنہ ان کی اسلامی غیرت ان کو ایک ایسے شخص کے خلاف سازش کرنے سے ضرور روکتی کہ جس نے اسلام کیلئے اپنے دور حکومت میں قابل قدر خدمات سرانجام دی تھیں۔ قرآن پاک کے غلطیوں سے پاک نسخے کی اشاعت، جمعہ کی تعطیل، حج مبارک سے پابندی اٹھانا، شراب اور کلب پر پابندی قائد عوام کے سنہری اسلامی کارنامے ہیں لیکن ختم نبوت کے مسئلے کا حل ایسا گرانقدر کارنامہ ہے جس کی صحیح معنی میں تعریف برصغیر کے وہ فرزند جلیل کر سکتے ہیں کہ جنہوں نے اپنی زندگیاں اس مسئلے کو حل کروانے کیلئے وقف کر دی تھیں۔ ہزاروں ختم نبوت کے پروانے ہیں، کہ جنہوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔

لیکن ان فتویٰ باز مُلا حضرات کو دین سے نہیں بلکہ دولت سے سروکار تھا، مُلا حضرات کی فتوائیں اور استحصالی قوتوں سے بیزاری محض اس لئے تھی کہ کمزور قوی بن رہا تھا، محکوم کو حق حاکمیت حاصل ہو رہا تھا، محل و قصر شاہی کے بجائے رعیت کے سامنے کھلے میدانوں میں فیصلوں کی شروعات ہو رہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ انقلاب، جمہوریت اور انسانی آزادی کے دشمن آپس میں مل کر بیٹھے اور قائد عوام کے انقلابی پروگرام کو روکنے اور ناکام کرنے کیلئے منظم انداز میں سازشیں کرنے لگے۔ اس مرتبہ ان سازش کاروں کے عالمی آقاؤں نے ان کی بھرپور مدد کی اور اس سازش میں ظالمانہ نظام کو جاری رکھنے والے بھی افراد اور اداروں نے اپنا منفی اور عوام دشمن کردار ادا کیا۔ بالآخر ۵- جولائی ۱۹۷۷ء کو عوام کے منتخب وزیراعظم، پاکستان

www.bhutto.org

میں پہلے انقلابی دور کے مؤجد ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو زات کے اندھیرے میں حکومت سے ہٹا کر، عوامی حاکمیت کا خاتمہ کر کے انقلاب کے بہاؤ کا راستہ روکا گیا۔ ۵- جولائی کے بعد غاصب حکمران، جس نے اعلان کیا تھا کہ ۹۰ دنوں کے اندر انتخابات منعقد کئے جائیں گے، نے اپنے سبھی وعدوں کی اُنحرافی کرتے ہوئے اپنی ظالمانہ حکومت کو طول دینا شروع کیا۔ یہاں تک کہ بیت اللہ میں کیا گیا وعدہ بھی وفا نہ کیا۔ اقوام متحدہ میں دنیا کی مہذب اقوام کے سامنے انتخابات منعقد کرنے والے وعدے سے بھی منہ پھیر کر ملک کو رسوا کیا۔ غاصب حکمران گروہ اور اس کے عوام دشمن حواریوں نے اپنے وجود کا پورا زور لگایا کہ پیپلز پارٹی کو ختم کیا جائے اور عوام میں سے قائد ذوالفقار علی بھٹو کا اثر زائل کیا جائے، لیکن عقل کے اندھوں کے سبھی حیلے بہانے بیکار ثابت ہوئے، کیونکہ حکمران جس کو آمر اور قاتل قرار دے رہے تھے، قوم اس کو اپنا نجات دہندہ اور محبوب لیڈر تسلیم کر رہی تھی۔ پروپیگنڈہ عوام میں بے اثر ثابت ہوئی۔ سچ فرمایا ہے قائد عوام نے کہ: ''تختہ الٹنا اور انقلاب میں بہت فرق ہے، کیونکہ انقلاب کے ساتھ آدرشوں کی حرکت و حرارت موجود رہتی ہے، اس کو عوام کی بڑی اکثریت کی جاں نثار تائید حاصل رہتی ہے، جبکہ تختہ الٹنے کے وقت یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ سیاسی مسائل کو ختم کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔''

قوم سمجھ رہی تھی کہ قائد عوام کو عوام دوستی کی وجہ سے حکومت سے الگ کیا گیا ہے، اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے پہلی مرتبہ عوام کو باشعور بنا کر ان میں حقیقی حکمران اور طاقتور ہونے کا احساس اجاگر کیا ہے:

بالآخر ظالم حکمران جب اپنی ہر سازش میں مایوس ہوئے تو انہیں قائد عوام کو جسمانی طرح ختم کرنے کے علاوہ اور کوئی صورت نظر نہ آئی اور وارثان ظلم و بربریت نے اپنے ظلم کی تاریخ دہرائی اور ایک عظیم انسان دوست کو سولی چڑھا دیا، لیکن قائد عوام کے قاتل، اقتدار کی ہوس میں اندھے جنرل، ان کے غیر ملکی آقا اور ان کے ملکی پٹھو، سرمایہ دار، وڈیرے، جاگیردار

www.bhutto.org

اور دین فروش مُلا، یہ بات بھول بیٹھے کہ اب بھٹو صاحب ان کے ہاتھوں مرنے والا نہیں ہے، کیونکہ وہ اب ایک فرد نہیں رہا بلکہ ایک نظریہ بن چکا ہے اور نظریے کبھی مرتے نہیں۔

بین الاقوامی تبصرہ نگاروں نے سچ کہا ہے کہ: ''مرا ہوا بھٹو زندہ بھٹو سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ عالمی تبصرہ نگار یہ بات سمجھ رہے تھے کہ بھٹو صاحب اب ایک فکر بن چکا ہے۔ فکر ظلم سے ختم نہیں ہوتا، افکار اپنی سچائی کے بل بوتے پر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور عوام کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ اس ملک میں قائد عوام کا فکر آج بھی عوام کی رہنمائی کر رہا ہے اور انشاء اللہ آنے والے وقت میں قائد عوام کی تاریخی جدوجہد اور زرین اصولوں کی روشنی میں عوام اپنی منزل مقصود ضرور پالے گا۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ فکر قائد عوام کے پیروکار اپنے مقاصد کے ساتھ پرخلوص ہو کر جدوجہد کریں۔ یہ بھی تاریخ کا سبق ہے کہ نافذ ان نظریہ پہلے خود نظریوں کا بہترین نمونا ہوتے ہیں۔

نظریے کھوکھلے نعروں سے نافذ نہیں ہوتے۔ ان کے نفاذ کے لئے دانشمندی، اتحاد اور انتھک جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ تتر بتر لوگ انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔ ظالمانہ نظام کو جاری رکھنے کے لئے بے پناہ منظم طریقے موجود ہیں، ان کو بھی مسمار اور تبدیل کرنے کیلئے بھی نظم وضبط کی ضرورت ہے۔ فکر قائد عوام کا نفاذ چاہنے والوں کو اسی راستے پر چلنا پڑے گا، جس راستے پر چل کے دنیا کی بہت ساری مظلوم قوموں نے اپنے سبھی انسانی، سیاسی، معاشی اور سماجی حقوق حاصل کئے ہیں۔ قائد عوام کے پیروکاروں کو سیاسی، انقلابی تعلیم و تربیت حاصل کرنا ہوگی۔

قائد عوام کا یہ فرمان تو اپنے پیروکاروں کیلئے واضح رہنمائی ہے:

''میری آپ سے گذارش ہے کہ اب آپ ایک ایک لمحے کو قیمتی سمجھیں۔ وقت آ گیا ہے کہ جب ہمیں دن رات کام کرنا ہے۔ یہ نہ ہو کہ چار دن جوش و خروش قائم رہے اور پھر جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں۔ اگر جوش و جذبے کو قائم رکھا گیا تو ولولہ کم نہ ہوگا۔ آپ جماعت کا سارا کام انتھک جدوجہد اور جوش و خروش سے شروع کریں۔ آپ کے پاس ایک

www.bhutto.org

مکمل انقلابی پروگرام سے مسلح پارٹی ہے، اس پروگرام کو اچھی طرح سمجھ کر گاؤں گاؤں اور شہر شہر پہنچائیں۔ یہ پروگرام سبھی مظلوم طبقوں کی آزادی کا پیغام ہے۔ یہ پروگرام ۲۲ خاندانوں کے استحصال اور اجارہ داری کا خاتمہ کردے گا۔ آپ ان اجارہ داروں کو چھوڑ کر پوری قوم کو متحد اور منظم کریں۔ اس بنیاد پر ایک وسیع تر قومی جمہوری محاذ قائم کریں، آپ کیلئے ضروری ہے کہ اس پروگرام پر عمل کیلئے ایک مزدور سے لیکر غریب ٹھیلہ چلانے والے تک، ایک دوکاندار سے قومپرست امیر تک، کسان سے ایک محب وطن زمیندار تک سبھی افراد کو اپنے ہمراہ بنالیں۔ آپ کے پاس عوامی پروگرام ہے۔ ایسے پروگرام اور منشور ہی عوامی تبدیلی کا منبع ہوتے ہیں اور سیاسی معاشی انقلاب برپا کرتے ہیں۔ ٹھوس پروگراموں اور نظریوں کی بنیاد پر جدوجہد کی جاتی ہے اور جو بھی تبدیلیاں لائی جاتی ہیں وہ ہمیشہ قائم ودائم رہتی ہیں۔ اسلام ہمارا دین ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے، سوشلزم ہماری معیشت اور طاقت کا سرچشمہ عوام ہے۔ یہ منشور آپ کی فتح کا علمبردار ہے۔ جلد از جلد عوام تک پہنچیں، جلسے جلوس منعقد کریں اور عوام کو جدوجہد کا پیغام دیں۔ عوام آپ کے آواز پر لبیک کہنے کیلئے تیار بیٹھے ہیں۔ مجھے ایک علاقے میں نہیں بلکہ پورے ملک میں کام کرنا پڑتا ہے، میرے اوپر بہت زیادہ ذمہ داریاں ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ میری عدم موجودگی کا احساس کئے بغیر اپنا کام مسلسل جاری رکھیں۔

مجھے فخر ہے کہ ہماری پارٹی میں ایسے کارکنان کی کمی نہیں جو کہ ہیروں جواہروں سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک دن سیاست کے آسمان کے چاند اور سورج بن کر روشن ہونگے۔ حالانکہ سیاست میں پہلے کسی نے ان کا نام تک سنا نہ ہوگا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے کہا تھا کہ ہماری پارٹی کو بڑے ناموں کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ پارٹی بڑے نام خود پیدا کرے گی، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عظیم نام عظیم کام سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ ہمہ وقت اپنے کام کا جائزہ لیتے رہیئے اور پارٹی میں تنقید اور خود احتسابی کا عمل جاری رکھیئے، کیونکہ یہ عمل پارٹی کو بہتر بناتا اور سنوارتا ہے اور اسے مضبوط اور منظم کرتا ہے۔"

پارٹی ہی انقلاب برپا کرسکتی ہے۔ پارٹی اپنی قیادت اور انقلاب کا تحفظ کرسکتی

www.bhutto.org

ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ آئین ہی قیادتوں اور انقلابوں کی بقاء کیلئے کافی ہے، یا ذمہ داری ہے۔ بے جان کتاب، پارٹی، قیادت یا انقلاب کو بچانے کی کوئی طاقت نہیں رکھتی۔ بے جان کتاب کے بجائے جاندار جماعتیں قیادتیں بچاتی ہیں، انقلاب کو استحکام عطا کرتی ہیں۔ دنیا کے انقلابی ممالک میں آئین انقلابوں کے خلاف سازش کو نہیں روکتے، بلکہ انقلابی جماعتیں اپنی قیادتوں اور انقلابوں کو مضبوط بناتی آئی ہیں۔ یہاں بھی قیادت، پارٹی اور جمہوریت کی واحد ضمانت ایک منظم اور جاندار پارٹی ہی ہے۔

انقلاب کیلئے گروہ بندیوں پر لعنت بھیج کر اتحاد پیدا کرنا پڑے گا۔ اپنی انقلابی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی قائد عوام کی امانت اور ہماری کامیابی کی ضمانت ہے۔ پارٹی کے کارکنوں کو خوف و لالچ سے دور رہ کر عوام اور قوم کی بہتری میں پارٹی کے خلاف ہونے والی اندرونی اور بیرونی سازشوں کو ناکام بنانا ہوگا۔ پاکستان پیپلز پارٹی نام ہے قائد اور اس کے خاندان اور عوام کا۔ پاکستان پیپلز پارٹی قائد اور اس کے خاندان اور عوام کی بے پناہ قربانیوں کا ثمر ہے۔ قائد عوام کا خاندان اور پیپلز پارٹی عوام کی کامیابی اور حکمرانی کیلئے ضمانت کی علامت ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی قائد عوام اور اس کے خاندان کی عوام کیساتھ بے مثال اور لازوال محبت اور وابستگی کو ہنوز قائم دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ اس ملک میں فکر قائد عوام کا نفاذ ناگزیر ہے، کیونکہ عوام آج قائد عوام کو اپنا رہبر تسلیم کرتے ہیں۔ بے پناہ ظلم و جبر، قید، کوڑے، جرمانے، پھانسیاں بھی عوام کو اپنے قائد، اس کے خاندان اور پارٹی سے دور کرنے میں ناکام رہے ہیں اور جب عوام اپنے عظیم قائد کی حقیقی وارث صاحبزادی بینظیر بھٹو صاحبہ کو تکالیف، سختیاں، قید اور جلاوطنی جھیلنے کے بعد بھی بڑی بہادری کے ساتھ اپنی رہنمائی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انہیں اپنی کامیابی پر کامل ایمان آجاتا ہے۔ سلام ہے قائد عوام پر جس کے ورثاء ایسے ہیں۔

سلام صاحبزادی بینظیر بھٹو صاحبہ پر کہ جس نے اپنے عظیم باپ کی خواہش کی تکمیل کیلئے تکالیف اور دکھ کا راستہ قبول کر کے عوام کی رہنمائی کی۔ اس کی بہادری، ہمت، حوصلہ، دانشمندی، مقصد سے سچائی اور عوام سے وابستگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس قوم کی تقدیر بینظیر

www.bhutto.org

صاحبہ ہے، قائد کی تصویر بینظیر صاحبہ ہے۔ بھٹوازم کی تفسیر بینظیر صاحبہ ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور بینظیر صاحبہ لازم وملزوم ہیں اور پاکستان پیپلز پارٹی اور بینظیر صاحبہ عوامی حاکمیت اور عوامی فتح کیلئے ضروری ہیں۔ وہ جو چاہتے ہیں کہ اس ملک میں فکر قائد عوام نافذ ہو، ان پر لازم ہے کہ پیپلز پارٹی اور اس کی عظیم قیادت کی حفاظت اور پاسبانی کریں۔ ملک کے ہر ایک غریب، مزدور، کسان، نوجوان، مظلوم عورت اور ترقی پسند سوچ رکھنے والوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے، کہ وہ بینظیر صاحبہ اور پارٹی کی حفاظت کریں، کیونکہ یہ دونوں ہی ان کیلئے بہت ضروری ہیں۔

فکر قائد عوام کی ضرورت ہے مسکین کسانوں، مزدوروں، نوجوانوں، مظلوم عورتوں اور عوام دوستوں کو۔ کیونکہ بھٹوازم بھوک، بیماری، ظلم و جبر اور جہالت کے خاتمے کی جدوجہد ہے۔ فکر قائد عوام محض ماضی کے کارنامے نہیں ہے، یہ حال کی ضروریات اور وقت کی تقاضاؤں کو قائد عوام کے انقلابی اصولوں کی روشنی میں مکمل کرنے کا نام ہے۔

نظریہ ساکت پانی جیسا نہیں ہوتا۔ سچے افکار کا بہاؤ وقت کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ اس لئے آج کی قومی ضروریات کو پورا کرنا بھی بھٹوازم ہے۔ افکار میں عوام کی خوشحالی اور آسودگی پنہاں ہوتی ہے۔

وقت کی ضروریات سے منہ پھیرنا نظریات کی موت ہے۔ فکر قائد عوام تو ہے ہی وقت کی آواز۔ بھٹوازم کا مطلب ہی ہے عوامی جدوجہد کی رہنمائی کر کے عوام کے لئے آسودگی سے آراستہ، پرامن اور برادرانہ سماج قائم کرنا۔ ملک کو آزادانہ، غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی پر چلانا، سرمایہ داری، وڈیرا شاہی اور افسر شاہی کے ظلم سے عوام کی جان کو آزادی دلا کے سوشلزم کی طرف قدم بڑھانا، کیونکہ قائد عوام کے خوابوں کی تعبیر سماجی مساوات والا سماج ہی ہے۔

اسی سماج کیلئے جدوجہد بھٹوازم ہے۔

یہی ہماری منزل ہے۔

www.bhutto.org

مدبر بھٹو

دوستو اور ساتھیو!

کسی زمانے میں ہندوستان پر بکرماجیت نامی ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا، اسے بہت بڑا بہادر مانا جاتا تھا، لیکن اس کے انصاف کی دھوم بھی چاروں اور مچی ہوئی تھی۔ وہ اپنے 'راج سنگھاسن' پر بیٹھتا تھا، جس کے پائے پتھر کے تھے اور پتھر شیر کے شکل میں تراشے گئے تھے۔ بکرم کی وفات کو سینکڑوں برس بیت گئے۔ اس کا شہر کھنڈرات میں تبدیل ہوگیا، جس پر درخت اگ آئے اور کھنڈرات ایک جنگل کی صورت اختیار کر گئے۔ اس جنگل میں کچھ لڑکے گائیں چراتے تھے، ایک دن کھیلتے کھیلتے کسی بات پر وہ آپس میں جھگڑ پڑے، انہوں نے ایک اور لڑکے کو ثالث مقرر کیا کہ وہ روئداد مقدمہ سن کر فیصلہ کرے کہ سچا کون ہے؟ ثالث لڑکا ایک سرسبز ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ اس نے مقدمہ سن کر انصاف کرنے کیلئے ایسی تقریر کی کہ آس پاس میں کھڑے کچھ دیہاتی حیران رہ گئے۔ وہ گوالوں کا گاؤں تھا، اس واقعے کے بعد جب بھی گاؤں میں کوئی مسئلہ ہوتا تو کسی بچے کو پنچ بنا کر اس ٹیلے پر بٹھایا جاتا اور وہ فیصلہ سنایا کرتا اور انصاف ایسا کرتا کہ اس میں سُقم نہ ہوتا۔ یہ خبر مشہور ہوئی اور راجہ تک پہنچی۔ راجہ نے اپنی دربار کے عالموں سے پوچھا کہ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ ایک بڈھا دانشمند بولا کہ کسی زمانے میں مہاراجہ بکرم یہاں رہتا تھا اور سلطنت کرتا تھا، جہاں آج یہ جنگل ہے۔ وہ اپنے مشہور سنگھاسن پر بیٹھ کر عدالت کرتا تھا۔ وہ ضرور اس ٹیلے کے نیچے ہوگا۔ بے شک آواز تو گوالے لڑکے ہی کی ہوتی ہے، مگر دماغ بکرم کا ہوتا ہے، یہ سن کر راجہ کو خواہش ہوئی کہ وہ یہ راج سنگھاسن حاصل کرے، اس کے بعد اس ٹیلے کی کھدائی کی گئی اور سنگھاسن حاصل کیا گیا اور بادشاہ کے دربار میں لایا گیا۔ اگلے دن راجہ عدالتی لباس پہن کر بیٹھنے گیا، تو خوف کے مارے دوہٹ گیا، کیونکہ سنگھاسن کے پتھر کے شیر بولنے لگے کہ تم بکرم کے تخت پر بیٹھنے کے قابل نہیں ہو، اس پر بیٹھنے کیلئے بچے جیسا پاک اور گناہ سے مبرا دل چاہیے، جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ تخت آسمان کی طرف اڑ گیا۔

www.bhutto.org

یہ ایک سادہ سا تاریخی واقعہ ہے، جس میں مابعد الطبیعاتی ٹچ ہے۔ لیکن اس میں ایک پیغام ضرور ہے۔ جب پاکستان کی سیاست کی بات کرتے ہیں، تو اس کے راج سنگھاسن پر پہلی بار قائداعظم محمد علی جناح بیٹھے، ان کی وفات کے بعد پاکستانی سیاست میں توڑ پھوڑ شروع ہوگئی اور حقیقی سیاست کا وہ راج سنگھاسن کہیں دب کر ٹیلے کی صورت اختیار کر گیا اور کسی کو وہ یاد بھی نہ رہا۔ قائداعظم کے بعد قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو نے اس ٹیلے پر بیٹھ کر ملک اور عوام کی ترقی، خوشحالی کی بات کی، اور ان کا دل بھی بچے جیسا پاک اور گناہوں سے مبرا تھا۔ لیکن جب باطل قوتوں نے اس سچ کے علمبردار کو تختہ دار پر لٹکایا، تو وہ حقیقی راج سنگھاسن آسمانوں کی اور اڑ گیا، جو ابھی تک واپس نہیں ہوا۔ وہ راج سنگھاسن واپس اس ارض مقدس پر اتر سکتا ہے، یہ بات ممکن ہے لیکن اس کیلئے شرط یہ ہے کہ ہم فکر قائد عوام سے استفادہ کریں اور اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلیں، وہ راہ جمہوریت کی راہ ہے، جو راہ مساوات کی راہ ہے اور ایک نئے اقتصادی نظام کے قیام کی راہ ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ ہمارے قائد ذوالفقار علی بھٹو پاکستانی سیاسی تاریخ کی ایک ممتاز ترین شخصیت ہیں۔ قائداعظم کے بعد وہ واحد شخصیت ہیں جن سے عوام نے اپنے بے انتہا پیار اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ وہ صاحب فکر و بصیرت تھے، وہ حالات کے نبض شناس تھے، ان کی زندگی ایک جھرنے کا منظر پیش کرتی ہے، جس میں بہاؤ ہے، حرکت و حرارت ہے، جو کہیں تک نہیں سکتا، بس آگے چلتا جاتا ہے۔ اور چلنے میں ہی اس کی زندگی ہے، اس کی شناخت ہے۔

فکر قائد کے سلسلہ میں آج ہم شہید بھٹو کے ایک نئے زاویہ پر بات کریں گے۔ جہاں سے ہمیں پتہ چلے گا وہ ایک کامیاب و کامران سیاستدان ہی نہ تھے، بلکہ اس کے ساتھ ایک سیاسی مدبر، ماہر قانون اور اعلیٰ قسم کے ادیب و انشا پرداز بھی تھے۔ اس پہلو پر گفتگو کرنے کیلئے ہم ان کی سیاسی زندگی اور حکومتی دور سے پہلے کے زمانے موضوع بنائیں گے، تاکہ ہمیں یہ جاننے کا موقعہ ملے کہ وہ حکومت کے مختلف فرائض منصبی نبھانے سے پہلے ہی صاحب فکر و نظر تھے۔ اس موضوع کو بات کرنے کیلئے اس لئے بھی چنا گیا ہے کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ قائد عوام نے حکومت میں آنے کے بعد ہی اپنا لوہا منوایا۔

موضوع پر باقاعدہ گفتگو کرنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہم آج قائد عوام کے

www.bhutto.org

مختلف مقالہ جات اور مضامین کو ماخذ بنائیں گے، جو کہ ۱۹۴۸ء سے لیکر ۱۹۵۶ء کے درمیان لکھے گئے۔ یہ مقالے اور مضامین اپنے اندر بہت بڑی موضوعاتی وسعت رکھتے ہیں، جو کہ قائد عوام کے وسیع مطالعے کا نچوڑ اور ان کی مدبرانہ صلاحیتوں کے عکاس ہیں۔ اس کے علاوہ چند ایک مضامین ایسے بھی ہیں، جو کہ ان کے ادیبانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہیں، جن میں زبان و بیان کی دل پذیری ہے، لب و لہجہ کی چاشنی ہے اور تصورات اور خوابوں کو ایک زمین اور زمانہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مقالے اور مضامین تاریخی حوالوں اور دلائل سے مالا مال ہیں، جنہیں یکجا کر کے نئے نئے اور اچھوتے مطالیب اخذ کئے گئے ہیں، جو کہ تجزیہ نگاری کے فن پر عبوریت کی گواہی دیتے ہیں۔

گفتگو کا آغاز کرتے ہیں قائد عوام کے زمانہ طالب علمی کی تحریروں سے، یہ ۱۹۴۸ء کا زمانہ ہے، جب بھٹو صاحب حصول تعلیم کی غرض سے امریکہ میں رہائش پذیر تھے۔ وہ ایک نوجوان تھے اور یہ زمانہ خوابوں کا زمانہ ہوتا ہے، لہٰذا قائد عوام نے بھی سپنوں کا جہاں آباد کیا، وہ خواب رومانوی نوعیت کے تھے۔ اس زمانے میں ان کا مضمون "دنیا کا آفاقی تصور" سامنے آیا اور وہ کہہ رہے تھے:

"آج میرا دل کچھ اس طرح خون کے آنسو روتا ہے کہ اس سے قبل کبھی بھی نہیں رویا تھا۔ ایک عالمی شہری کی حیثیت سے میں یہ اپنا مقدس فریضہ سمجھتا ہوں کہ لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کروں کہ اب ہماری نجات دنیا کے ایک ہو جانے میں ہے۔ ہمیں جنگ اور امن، موت اور حیات میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا، یقیناً ہر کس و ناکس کو اس حقیقت کا علم ہے کہ نہ صرف آج کی دنیا بلکہ کل کی دنیا بھی کسی مزید جنگ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔"

اوپر دیئے گئے اقتباس میں مندرجہ ذیل باتیں توجہ طلب ہیں:

۱) ایک عالمی شہری کی حیثیت سے اپیل۔

۲) ہماری نجات دنیا کے ایک ہو جانے میں ہے۔

۳) جنگ و امن میں سے کسی ایک کا انتخاب۔

۴) آج خواہ کل دنیا کسی مزید جنگ کی خواہاں نہیں ہے/تھی۔

آپ ان باتوں پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ نوجوان ذوالفقار علی بھٹو اپنے زمانہ طالب علمی میں اپنے آپ کو علاقائیت کے دائرے سے باہر ایک عالمی شہری گردانتے تھے،

www.bhutto.org

اسی حیثیت سے انہیں یہ ادراک تھا کہ اس دنیا کی نجات ایک ہو جانے میں ہے، یہاں پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں وہ شروع سے ہی انسانیت پسند تھے اور کسی حد تک اشتراکی نظریے سے متاثر تھے۔ زمانہ شباب سے ہی وہ امن کے خواہاں اور جنگ کے انکاری تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ کرہ ارض امن، برادری اور آزادی کا گہوارہ بنے، ایسا جھولا ہر ایک ملک وقوم، کسی رنگ ونسل کا امتیاز برتنے کے بغیر جھولے اور جیتنے اور جینے کا لطف اٹھائے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب دوسری جنگ عظیم کو گزرے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔ پرانی راکھ میں سے نئے پھول اگانے کی جستجو کی جارہی تھی، انسانیت جن احساسات سے گزر رہی تھی، وہی نوجوان بھٹو کی سوچ کا محور ومرکز تھا۔

امن عالم کیلئے کوششیں کی جارہی تھیں۔ اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ لیکن آپ کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ نوجوان بھٹو اس نئے عالمی پلیٹ فارم کے طریقہ کار سے مطمئن نہ تھے، ان کے اندر ایک تڑپ اور ایک خلش جنم لے رہی تھی، ایک خلاء تھا جو پُر ہونے کا مختظر تھا۔ جس کا اظہار مذکورہ بالا مضمون میں آگے چل کر انہوں نے کیا:

''اقوام متحدہ کا طریق کار مجھے اور بھی بے چین ومضطرب کر دیتا ہے۔ جلیل القدر افراد کا یہ عظیم اجتماع تیزی سے جعلی پلیٹ فارم میں تبدیل ہوتا جارہا ہے، یقیناً اپنی خواہشات وتوقعات کو استہزا اور تصنع سے وابستہ نہیں کرنا چاہیے۔ نہیں، ہمیں ٹھوس تعاون کی ضرورت ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام متحدہ میں پیش کردہ کوئی مسئلہ بھی تسلی بخش طور پر حل نہیں کیا جاسکتا۔''

میں پھر دہرا رہا ہوں کہ ''اقوام متحدہ میں پیش کردہ کوئی مسئلہ بھی تسلی بخش طور پر حل نہیں کیا جاسکتا۔'' یہ بات ہمارے روشن دماغ لیڈر نے آج سے اٹھاون برس قبل محسوس کی تھی۔ اس وقت ہم اس عظیم تنظیم کی بے بسی کو جان چکے ہیں اور اس کا کردار کھل کر سامنے آگیا ہے۔ مگر جس دور میں شہید بھٹو یہ الفاظ کہہ رہے تھے اس وقت اس ادارے کی حیثیت نوزائیدہ بچے کے جیسی تھی ابھی اسے بہت آگے جانا تھا۔ امن عالم، عالمی برادری اور انسانی حقوق کے سلسلے میں بہت کچھ کرنا تھا، لیکن اس کی مخصوص تشکیل کی وجہ سے ہمارے قائد نے یہ جان لیا تھا، کہ جن مقاصد کو بنیاد بنا کر یہ ادارہ بنایا گیا ہے، وہ کبھی بھی پورے نہیں ہو سکتے، کیوں؟ اس لئے کہ اس کا پورا ڈھانچہ کچھ قوتوں کی مرضی سے حرکت میں آتا ہے، ایک طرف پوری دنیا بھوک، افلاس، بیچارگی اور بے بسی کے دلدل میں دھنسی

www.bhutto.org

ہوئی ہے، جنگی ماحول مسلط کیا گیا ہے، عالمی مالیاتی ادارے ترقی، غربت مٹانے یا کم کرنے اور لوگوں کا معیارِ حیات بلند کرنے کے آڑے اقتصادی طور پر ساری دنیا کو غلام بنا رہے ہیں، تو دوسری جانب بہت سارے ممالک جنگ کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ کیا یہ ادارہ غیر جانبدار ہے؟ یہ اس دور کا ایک بہت بڑا سوال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پلیٹ فارم اپنی ساکھ کھو چکا ہے اور اب یہ کچھ عالمی قوتوں کے اسٹیبل کے سوائے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں آپ کو یہ بات باور کرانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ جو کچھ آج ہو رہا ہے، اس کو ہمارے شہید قائد نے آج سے اٹھاون برس قبل ہی بھانپ لیا تھا:

''اقوام متحدہ میں کوئی پیش کردہ مسئلہ بھی تسلی بخش طور پر حل نہیں کیا جا سکتا۔''

اقوام متحدہ کی تشکیل و تعمیر میں منافقت، دکھاوے اور دوغلے پن کا ریتہ استعمال کیا گیا ہے۔ جب یہ صورت حال سمجھ میں آتی ہے تو انسان جذباتی سطح پر مغمومیت کی گہرائیوں میں اترنے لگتا ہے، چند لمحے اسی بے بسی کے عالم میں رہنے کے بعد اس میں ایک نئی خواہش، نئی تمنا انگڑائیاں لے کر جاگتی ہے اور وہ مفادات اور مطلب پرستی کے گارے سے بنی ہوئی دنیا سے بغاوت کرنے لگتا ہے، اسے سب کچھ ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اسی حالت میں وہ سہارا تلاش کرتا ہے تو بے اختیار اس کے ہونٹوں پر ''محبت'' کا نام آ جاتا ہے، محبت جس کی اساس ایٹم بم پر نہیں، سادگی پر ہے۔ کچھ ایسا ہی اپنے عہد جوانی میں ہمارے قائد سوچ رہے تھے:

''صمیم قلب سے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہم اس سیاست کے مردہ طریق کار سے اجتناب کرتے ہوئے اپنا جہاں ایک نئے انقلابی نظام پر تشکیل کریں۔ میں یہاں اقوام متحدہ کی خوبیاں یا خامیاں گنوانے نہیں آیا، میں صرف اس نظریے کی وکالت کر رہا ہوں کہ پوری دنیا ایک ہے خواہ آپ فیڈریشن کہہ لیجئے یا کنفیڈریشن کا نام دے دیجئے، جو چاہے پکاریئے، لیکن اطمینان رکھئے کہ ہماری اس متحد دنیا کا ہتھیار ایٹم بم نہیں، محبت ہے، جس کی اساس سادگی پر ہے۔''

محبت کی اساس پر ایک نیا انقلابی ڈھانچہ تعمیر کرنے کیلئے دنیا کے عوام میں اتحاد لازم ہے، اتحاد بڑی قوت ہے۔ جو کہ دنیا کی بڑی اکثریت کو ایک اجارہ دار اور قبضہ گیر اقلیت سے چھٹکارا دلا سکتی ہے، یہی قوت ہے جو مساواتِ انسانی کو ایک ایسے دھارے کا روپ دیتی ہے کہ وہ ہر رکاوٹ توڑ کر

www.bhutto.org

آگے نکل جاتا ہے۔ ہمارے قائد بھی اتحاد کی اپیل کرتے ہیں اور یہ اپیل سیاستدانوں سے نہیں، طلباء اور عوام سے بھی ہے:

"ایک دنیا کے قیام کیلئے میری استدعا سیاستدانوں سے نہیں بلکہ عوام سے بھی ہے اور خصوصیت سے میں طلباء سے گزارش کرتا ہوں، کہ میرے ساتھی بھائیو، متحد ہو جاؤ، ہمیں اس دنیا میں رہنے والے ہر آدمی کی بہتری مقصود ہے۔"

ہمارے قائد کے خیالات شروع سے ہی انقلابی نوعیت کے تھے۔ وہ شروع سے ہی گہری سوچ بچار کے عادی تھی، ابھی وہ نو عمر ہی تھے اور زیرِ تعلیم تھے، لیکن انہیں عوام پر یقین تھا اور طلباء پر بھروسہ تھا، یہاں سے ہم یہ نتیجہ بے اخذ کر سکتے ہیں کہ جب بعد میں وہ اعلیٰ حکومتی منصبوں پر فائز ہوئے تو انہوں نے عوام اور طلباء پر ہی بھروسہ کیا، اور انہیں اپنی قوت کا سرچشمہ قرار دیا۔ مطلب کہ شروع سے ہی وہ عوام سے محبت کرتے تھے اور اسے خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ انسانی آزادی کو بہشت سمجھتے تھے، جب کبھی اپنے چوگرد پریشان کن حالات کو ڈیرہ ڈالتے ہوئے دیکھتے تھے تو وہ ٹیگور کو یاد کیا کرتے تھے:

جہاں دل کو خوف نہیں ہے اور سر بلند ہے،
جہاں علم مفت دیا جاتا ہے
جہاں دنیا کو تنگ خانگی دیواروں میں ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جاتا
جہاں سچائی کی گہرائی سے الفاظ پھوٹتے ہیں
جہاں علم پیہم تکمیل کی طرف پرواز کئے ہوئے ہے
جہاں عقل و دانش کا شفاف چشمہ
مردہ عادات کے ہولناک صحرا میں
اپنی راہ گم نہیں کرتا
جہاں "تو" ذہن کو وسعت پذیر، خیال آور اور عمل پیہم کی طرف لے جا رہا ہے
اے میرے مولا!
آزادی کی اس بہشت میں میرے ملک کو بیدار کر دے۔

www.bhutto.org

''دنیا کا آفاقی تصور''، یہ وہ پہلی تحریر ہے جو ہمیں میسر ہو سکی ہے، جس میں ہمارے قائد نے دنیا کے ایک ہو جانے کی تبلیغ کی ہے۔ اس مضمون کے بعد ہم چلتے ہیں ایک اور مقالے کی طرف جس کا عنوان ہے ''اسلامی میراث کے خدوخال''۔ یہ تحریر دراصل ایک طویل خطاب ہے، جب یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو قائد عوام نے جنوبی کیلی فورنیا کی یونیورسٹی میں اپنے سامعین کے سامنے اسلامی اثاثے کا خزانہ کھول کر رکھ دیا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۰ سال تھی۔ یہ تحریر ہمیں قائد عوام کے ایک خواب کی طرف اشارہ کرتی ہے، جس کی تعبیر وہ اپنی حکومتی دور میں کرتے نظر آئے، وہ خواب تھا اسلامی ممالک کا، اتحاد باہمی۔

اس وقت آپ دیکھ سکتے ہیں، کہ اس دنیا کو واضح طور پر دو حصوں میں بانٹا گیا ہے ایک طرف عیسائی ہیں اور ان کے ساتھ یہودی کھڑے ہیں تو دوسری جانب مسلم دنیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے متصادم بتائے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ ایک خود ساختہ اور یک طرفہ جنگ ہے، جو کہ مغرب اور امریکہ کے ذہن کا اختراع ہے۔ جس کو ''تہذیبوں کا تصادم'' کا نام دیتے ہیں۔ اس جدید نعرے کے تحت اسلامک دنیا کے اوپر جنگ مسلط کی گئی ہے۔ ایک ایسا ماحول تیار کیا گیا ہے کہ جو بھی مسلمان ہے اسے انتہا پسند اور دہشت گرد سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک غیر حقیقی تشریح ہے۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد والی دنیا مسلم دنیا کے حق میں نظر نہیں آ رہی ہے۔

اب حالات تبدیل ہو رہے ہیں اور عالمی ضمیر کو یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے، کہ امریکہ اور مغرب نے دنیا کا دھیان اپنی استحصالی پالیسیوں اور مالیاتی اداروں کی لوٹ کھسوٹ سے ہٹانے کیلئے یہ سارا ڈھونگ رچایا ہے۔ مسلم دنیا امریکہ اور مغرب سے ٹکراؤ میں کس طرح آ سکتی ہے، جبکہ مسلمان ممالک کی اکثریت پر امریکہ اور مغرب کا قبضہ ہے۔ وہاں پر ان کی اجارہ داری ہے، تو کیا شام، ایران یا لیبیا کی طرف سے امریکہ اور مغربی دنیا کو کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، مسلم دنیا میں سے کون امریکہ سے لڑے گا، فلسطین یا لبنان، افغانستان کہ عراق! یہاں یہ بات آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ تہذیبوں کا تصادم، نامی کوئی چیز موجود نہیں ہے، تو پھر یہ جنگ، یہ لشکر کشی، یہ ہوائی حملے، یہ ڈرانے دھمکانے والا ماحول کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اگر مسئلہ دہشت گردوں کا ہے تو وہ لوگ کسی کے بھی نہیں ہیں، وہ بے چہرہ، بے نام اور بے ملک ہیں، ان کے حصہ کی سزا سب کو کیوں دی جا رہی ہے؟

www.bhutto.org

یہ بات بھی اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ عالمی ضمیر، دنیا کے پر امن عوام نے ''جنگ برائے تیل'' کا نام دیا ہے۔ آج ہر کسی کے ہاتھ میں ایک بینر ہے، جس پر لکھا ہوا ہے کہ:

NO WAR FOR OIL

ہمارے قائد نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا، کہ اگر مسلمان دنیا مل کر ایک ہو جائے تو وہ اپنا کھویا ہوا وقار واپس لا سکتی ہے۔ مسلمان ایک نئی دنیا آباد کر سکتے ہیں۔ اپنے اس خطاب میں وہ مسلمانوں کے مجموعی تہذیبی اثاثوں کی وکالت کرتے نظر آتے ہیں، اسلام کا دفاع کرتے ہوئے وہ ایسی تصویر کھینچتے ہیں، کہ جس میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ مغرب نے جو اسلامک پورٹریٹ تیار کیا ہوا ہے ایک Still Painting ہے جو کہ ایک رخ پیش کرتی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصویر Multi Dimentional ہے، اس کے اور بھی بہت سے اطراف ہیں، جہاں سے دیکھنے سے ہی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔ یہ خطاب جو کہ اب تحریری صورت میں ہے، قائد عوام کے وسیع تر اسلامی مطالعے کی شاہدی دیتا ہے۔ وہ اپنی گفتگو کا باقاعدہ آغاز چھٹی صدی سے کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس وقت عرب عالمی تہذیب کا گہوارہ تھا اور:

''ایک طرف مصر میں اسکندریہ، شام میں دمشق، ایشیائے کوچک میں انطاکیہ، میسوپوٹیمیا، قدیم بابل، عراق میں بغداد۔۔۔۔ دوسری طرف یونان کا جاہ و جلال، روم کی شان و شوکت اور بازنطینی سلطنت کی عظمت و سطوت تھی۔''

اس کے بعد وہ محمدؐ کی پیدائش اور نبوت کے اعلان کے زمانے کی جانب آتے ہیں اور کہتے ہیں:

''بدو ایک عظیم طاقت سے جاگ اٹھے، ایک مقدس اور عظیم الشان قوت نے ان کی کایا پلٹ کر دی۔ اس فعال قوت کا سرچشمہ محمدؐ کی ذات اقدس تھی، جن کے دین کے نور نے تیزی سے تین براعظموں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔''

تین براعظموں تک پھیل جانے والے اسلام کے بعد وہ صلیبی جنگوں اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین مختلف معاہدوں تک جاتے ہیں، مسلمان دنیا کے کارنامے بتاتے ہیں، مسلمان سائنسدانوں کی سائنسی تجربات و ایجادات کے حوالے دیتے ہیں اور آخر کار تاریخ کی مختلف گلیوں کوچوں

www.bhutto.org

سے گزر کر اپنے اصل مقصد کے طرف آتے ہیں:

''ہم ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں، جسے باہمی نزاع نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ ایک دنیا جس میں بین الاقوامی تعلقات دو وجوہ سے غالب ہیں، ایک اجتماعی تحفظ، دوسرا طاقت کا توازن۔ مختلف ناسازگار ادوار نے ہمیں بلاکوں میں صف آراء کر دیا ہے۔ ایک سانس میں عالمی رہنما امن کی تبلیغ کرتے ہیں اور دوسرے میں ایٹم بموں سے تہذیب کو معدوم کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ ہماری حیثیت افسوسناک طور پر ناپائیدار ہے۔ سامراج نے دنیا کے ہر ایک حصے میں ہمارا خون نچوڑ لیا اور ہماری قوت کو مفلوج کر دیا۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کی نئی نسل، جو ایک نئی حرکت یعنی انصاف پر مبنی ایک نظام کی رہنما ہوگی، استحصال کا خاتمہ چاہتی ہے۔ اب بھی ہم میں متعدد یکسانیت کے رشتے برقرار ہیں، اور اپنی ثقافت کی وحدت کی بناء پر ہم سیاسی طور پر دوبارہ متحد ہو سکتے ہیں۔ اسلامی کنفیڈریشن مسلمانوں کو ان کی محفوظ مستقبل کی ضمانت دے سکتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے ہمیں شدنی امور سے نبرآزما ہونا پڑے گا۔''

وہ مسلمان دنیا کے باہمی اتحاد، اسلامک کنفیڈریشن کے تصور کے خالق تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں کے مابین ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اپنی نوعمری میں یقین کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ باہمی رشتوں کو مضبوط و مستحکم بنایا جا سکتا ہے۔ وہ قوموں کے باہمی تعاون کو ترقی پسندانہ قدم تصور کرتے تھے۔ ان کو اسلامی ورثے کو بچانے کی خواہش تھی، جو کہ ان کے خیال کے رو سے ایک اتحاد کا تقاضا کرتی تھی۔ انہیں احساس تھا کہ اسلامی دنیا اگر خود انحصاریت کا طریقہ اپنالے تو اس کے پاس اقتصادی وسائل بکثرت تھے، اس بات کا ثبوت مڈل اور سنٹرل ایسٹ میں مغربی دنیا کی دلچسپی سے ملتا تھا۔

قائد عوام کو شروع سے ہی یہ احساس تھا کہ اسلامی دنیا کی کمزوری یہ ہے کہ بیرونی طاقتیں اس کے اقتصادی وسائل کا بے دریغ استعمال کر رہی ہیں، اس لئے انہوں نے اسلامی دولت کو محفوظ بنانے کیلئے اسلامی کنفیڈریشن کا نظریہ پیش کیا:

''اب میں اس منصوبے کا اجمالی سا خاکہ پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں، قانونِ ارتقا کے مطابق یہ شراکت (اسلامی باہمی اتحاد) مختلف سطحوں پر فروغ پائے گی۔ پہلی سطح پر عوام سے وسیع

www.bhutto.org

رابطے کے ذریعے ان کے درمیان وسیع ہم آہنگی کو ابھارا جائے گا۔ یہ رابطہ طلباء، پروفیسروں، فنکاروں اور دوسرے دانشوروں کے بڑے پیمانے پر تبادلے سے ہوگا۔ یہ دانشور کنونشنوں اور کانفرنسوں کے ذریعے اہم باہمی امور پر تبادلہ خیال کریں گے۔ اس اثناء میں بڑے بڑے شہروں میں مستقل طور پر اطلاعاتی، ثقافتی اور عوامی رابطے کے مراکز قائم کئے جائیں گے۔ ایک مسلم ملک سے دوسرے ملک میں عوام کے سفر کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور انہیں کرایوں میں رعایت دی جائے گی۔ پاسپورٹ کی پابندیاں اٹھائی جائیں گی اور مواصلاتی نظام کو فروغ دیا جائے گا۔ ان مساعی کے نتیجے میں اقتصادی تعاون کی راہ ہموار ہو جائے گی اور ایک سیاسی الحاق ان کے مابین وجود میں آجائے گا۔"

انہیں اس باہمی اتحاد پر یقین تھا، گو یہ ایک خواب تھا، جو کہ ہمارے شہید قائد کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ لیکن جب وہ خود برسر اقتدار آئے تو اس کو حقیقت کی سانچہ میں ڈھالنے کیلئے انہوں نے کوششیں کی۔ یہ کوئی سادہ سی بات نہیں تھی، جو کہ ایک بیس سال کے لڑکے نے ایک جذبے کے تحت کہہ دی تھی، اس کے برعکس یہ جینئس کا خواب تھا، یہ ان آنکھوں کا خواب تھا جو کہ تعبیر کو ترا شنے کیلئے تقدیر سے لڑ پڑتی ہیں۔ اس مضمون میں سے ہم یہ جان سکتے ہیں، کہ شہید بھٹو نے اسلامی دنیا کے باہمی اتحاد و الحاق کی سوچ شروع سے ہی پال رکھی تھی۔ جب وہ اقتدار میں آئے تو انہوں نے اسلامی دنیا سے اپنے روابط قائم کئے اور اسے ایک نیا روپ دینے کی سعی میں سرگرم عمل ہو گئے۔ یہی سبب تھا کہ ان کو ایک سازش کے تحت منظر سے ہٹایا گیا، اس طرح اسلامی دنیا ایک عظیم لیڈر سے ہی نہیں، بلکہ ایک عظیم ترین خواب سے بھی محروم ہو گئی۔ لیکن اس خواب کی گونج اب تک ہواؤں میں تحلیل نہیں ہوئی ہے۔ یہ صدا اپنا وجود باقی رکھے ہوئے ہے کہ:

"تقدیر باہمی اسلامی اتحاد کی متقاضی ہے۔ سیاسی حقائق اس کی صحت پر دلالت کرتے ہیں۔ آئندہ نسلیں اس کی منتظر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم اسے حاصل کر لیں گے۔ شجاعت ہمارے خون میں ہے۔ ہم عظیم ورثہ کے حامل ہیں، ہم یقیناً کامیاب ہونگے۔"

مختلف ادوار و اوقات ذہنِ انسان پر اپنا گہرا رنگ چھوڑتے ہیں اور اس کی وارداتِ قلبی اور احساسات کو ایک خاص شکل دیتے ہیں، تو مقامات بھی انسان کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے

www.bhutto.org

ہیں اور اس کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ مقامات کا حیاتِ انسان پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ بالخصوص عمارتیں انسان کو اپنے سحر میں جکڑنے کی طاقت رکھتی ہیں اور انسان عمارتوں سے اپنی جذباتی وابستگی قائم کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ عمارت گھر بھی ہے، عمارت خانہ کعبہ بھی ہے، عمارت تجارتی مراکز بھی ہیں، عمارت عدالت بھی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا، کہ انسان عمارتوں کے جنگل میں زندگی بسر کر رہا ہے، وہ عمارتوں سے اپنا رشتہ توڑ نہیں سکتا۔

شہید بھٹو نے اپنی تحریر "نیویارک کے تاثرات" میں عمارتوں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ یہ تحریر قائد کی سبھی تحریروں سے ممتاز اور منفرد اس وجہ سے ہے کہ یہ انہوں نے اپنے جذبات کی گہرائیوں کو چھو کر لکھی ہے۔ اندازِ تحریر میں نفاست کے ساتھ ایک قسم کی کاٹ ہے۔ تحریر کا لہجہ اداس مگر اثر پذیر ہے۔ جذباتِ قلبی کو تخلیقی انداز میں وقفِ قرطاس کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں نے اپنے (نیویارک میں) خوشگوار قیام کے دوران اس ملک کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس الوداعی سیر میں بہت سے خیالات و تصورات ذہن میں آئے اور گذر گئے۔ میں نے محسوس کیا، جیسے وہ مجھے احاطہ کئے ہوئے ہوں۔ میں خاموش اور ویران گلیوں، کوڑا کرکٹ صاف کرنے والوں، دودھ والوں اور ان پرشکوہ فلک بوس عمارتوں کو دیکھتا رہا، جو بظاہر اپنے اندر وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے بالکل لاتعلق اور بے نیاز ایستادہ ہیں، وقتی طور پر یہ سیمنٹ سے بنی ہوئی عمارتوں کے جنگل نظر نہیں آتی تھیں۔ وقتی طور پر وہ انسانی جذبات سے پر محسوس ہوئیں، یہ ایک بہت ہی عجیب و غریب احساس تھا، جس کا پہلے کبھی مجھے تجربہ نہیں ہوا تھا۔"

اس اقتباس سے آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ قائد نے اپنے احساسات و جذبات کو روح کی گہرائیوں سے تحریر کیا ہے۔ اس تحریر میں ایک اعلیٰ قسم کا ادیبانہ تخیل کارفرما ہے اور رنگین ادبی زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔

انہوں نے ایک اور زاویہ سے دیکھنا شروع کیا تو ان عمارتوں سے خیالات کے میلاپ سے یہ شعور بھی بھٹو صاحب نے حاصل کیا کہ:

"بلاشبہ یہ فلک بوس عمارتیں اب بے جان یادگاریں دکھائی نہیں دیتی تھیں، اب یہ انسانی عظمت کی عظیم الشان شخصیتیں معلوم ہونے لگی تھیں۔ یہ حقیقی تخلیق نظر آنے لگیں، انسانی مساعی کی واحد

www.bhutto.org

تخلیق، انسان کی اپنی روح کا انعکاس، انسانی مساعی کی بلند ترین رفعتوں کو چھونے کی علامت خاک اور پتھر سے تعمیر شدہ ڈھانچے مجھے انسانیت کے غلام اور خادم دکھائی دینے لگے۔''

انسانی عظمت اور کوشش کے اس تفاخر کے باوجود آگے چل کر ان نے ذہن میں یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ:

''یہ عظیم الشان تعمیراتی کمالات ہمارے مفاد کیلئے ہیں اور آیا ان پر ہمارا اختیار ہے؟ میں نے سوچا شاید یہ انسان کے دائرہ اختیار سے نکل کر بے قابو عفریت بن گئے ہیں۔''

تہذیب کی ان نشانیوں سے یہ بات افشائے راز ہوئی کہ: ''یہ عمارتیں انسان کے دائرہ اختیار سے نکل گئی ہیں اور عفریت بن گئی ہیں۔'' نیویارک (امریکہ) کے مقام پر ایسا خیال شاید انہیں اسلئے آیا کہ اسی مقام کی عمارتوں میں انسان و انسانیت کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی فیصلے ہوتے تھے۔ یہ فیصلے اس جگہ سے اڑتے پھیلتے ساری دنیا میں پھیل جاتے تھے، جہاں پہنچ کر وہ انتہائی انسانیت سوز واقعات اور نتائج کو جنم دیتے تھے۔ اس لئے انہیں محسوس ہوا کہ تعمیراتی ڈھانچے بے قابو عفریت بن گئے ہیں۔ اس لمحے پر وہ ہراساں ہوئے۔ ان کا تفاخرِ انسانی مجروح ہوا، تو ان کو اپنے روح کی آواز ان احساسات سے باہر لے آئی کہ:

''میں نے انہیں (پتھر کی بلند و بالا عمارتوں کو) بنایا ہے۔ یہ میرے جذبہ تفاخر کا اظہار تھا، جو میری ترقی اور خوش تدبیری کا ثبوت تھا، غاروں سے فلک بوس عمارتوں تک، تاریکی سے خیرہ کن روشنی تک یہ میری تکمیل کی نشانیاں ہیں۔ اس پر مجھے خوشی ہوئی اور میرا سر فخر سے بلند ہے۔''

کسی فارسی شاعر نے یہ کہا کہ زندگی ایک ایسی کتاب ہے، جس کا پہلا اور آخری صفحہ پھٹا ہوا ہے۔ اگر ہم اس بات کو صحیح بھی مان لیں کہ تو جانیں گے کہ دنیا میں زندگی اور موت کی بابت انسان کچھ وثوق سے کہہ سکتا، لیکن پھر بھی یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان دو پھٹے اوراق کے درمیاں جو بھی صفحات موجود ہیں، وہ عظمتِ انسانی کے گواہ ہیں۔ نظریات کی بنیاد پر کائنات اور انسان کی تخلیق اور ابتداء سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن غاروں سے لیکر عہدِ جدید کی ترقی کے شاہکاروں تک انسان کی محبت و مشقت، اس کی جستجو اور لگن سے کوئی انکار نہیں کیا جا سکتا، انسان وہ بھی جس نے دو پتھروں کو رگڑ کر کبھی آگ پیدا کی تھی، لیکن آج وہ تو انائی کے نئے نئے تجربے کر رہا ہے۔ کل تک وہ جنگلوں میں

www.bhutto.org

مارا پھرتا تھا، آج آسمانوں کی سیر کر رہا ہے۔ کل تک وہ تن ڈھانپنے کیلئے پتوں کا استعمال کرتا تھا، آج اس نے عمدہ کپڑہ بنانے والے لاکھوں کارخانے لگائے لئے ہیں۔ اس کا شعور ترقی اور اس کی فطرت سے بغاوت کی اساس ہے۔ یہ سماج جو اس نے تخلیق کیا ہے اور وہاں پر اپنی مرضی سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ دراصل انسان کی فطرت پر سبقت لینے کی اس خواہش کا اظہار ہے، جس کی پہلی کرن، آج سے صدیوں قبل اس کے دل کے صحن میں اتری تھی۔ ہمارے قائد نے بطور مجموعی محسوس کیا کہ یہ دنیا کی کمائی ایک انسان کی حیثیت سے درحقیقت اس کی اپنی ہی محنت کا نتیجہ ہے۔ بے شک عظمت انسانی ہی اس دنیا کی بڑی حقیقت ہے، جس پر ہر انسان کو فخر اور بڑائی کا احساس ہونا چاہیے۔

ہمارے قائد ایک باشعور اور روشن دماغ فرد تھے، اس لئے ان کے ذہن میں اس تفاخر کے باوجود یہ سوال ضرور ابھرا کہ:

"میں پھر سوچنے لگا کہ الاہی یہ ترقی ہے کہ تنزل؟ غار اور تاریکی کے ادوار اپنی خامیاں رکھتے تھے، لیکن حالیہ رجحانات تو نیکی کی حدود سے آگے نکل گئے ہیں۔ ابتدائی زمانے میں لوگ سادہ اور مہمان نواز ہوا کرتے تھے، اب وہ سرد مہر اور پیچیدہ ہو گئے ہیں، یہ ترقی ہے یا تنزل کے الفاظ کی گونج بمشکل ختم ہوئی ہوگی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، ہوٹل کا کلرک کہہ رہا تھا: جناب آپ کے جانے کا وقت ہو گیا۔"

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ یہ جدید سہولیات اور ترقی کے نئے نمونوں سے آراستہ دنیا انسان کی عظمت کا بشاہکار ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ دنیا ایک نہیں ہو سکی۔ جہاں ممالک واقوام ایک دوسرے کیلئے درپے آزار ہیں، روز سازشوں کا ایک نیا جال بنا جاتا ہے۔ مفادات کی بنیاد پر دوستی اور دشمنی طے ہوتی ہے۔ دراصل انسان کی تہذیب کی ترقی اندر سے کھوکھلی اور پولی ہے۔ ہمارے قائد نے اپنی اولین تحریر "دنیا کا آفاقی تصور" میں بھی یہ کہا تھا، کہ دنیا کی بھلائی ایک ہو جانے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا ترقی کی منازل طے کرنے کی بعد بھی اپنے اقدار و روایات میں پستیوں کے دلدل میں دھنسی ہوئی ہے۔ اس میں اتنی بیگانگی اور علیحدگی کہاں سے آئی؟ اقدار انسانی کیوں مسلسل زوال پذیر ہیں؟ اس کا جواب یہی ہے کہ شروع میں انسان جب غاروں میں رہتا تھا تو اس کی زندگی دل کی باہمی زنجیر سے بندھی ہوئی تھی۔ وہ ابتدائی انسان ایک دوسرے کی حفاظت کرتے

www.bhutto.org

تھے اور ایک دوسرے کا سہارا ہوا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے مددگار و معاون تھے۔ دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ لیکن پتھر کے اس زمانے کے اختتام کے بعد آہستہ آہستہ انسان دل کے رشتے سے آزاد ہوتا گیا۔ مادی ترقی کے جنون میں وہ اتنا آگے نکل گیا کہ اس نے یہ بات بھلا دی کہ اسے اپنی روح کی ترقی کی طرف بھی توجہ دینی ہے۔ اس طرح اس کا جسم تو جدید دنیا میں داخل ہو گیا، لیکن اس کی روح پتھر کے زمانے میں ہی کھڑی رہی۔ اس نظر اندازی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مادی میدان میں تو انسان نے بہت بڑے کارنامے سرانجام دیئے، بہت ترقی کی، لیکن یہ ترقی انسانوں کو ایک دوسرے سے ملانے کے بجائے دوری کا موجب بنی۔ امن کے بجائے جنگ اور سکھ کے بجائے دکھ کا سبب بنی۔ اعلیٰ انسانی اقدار تنزل کی کھائیوں کی طرف لڑھکتے گئے۔ آج کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اس بیگانگی اور دوری کو مٹانا بھی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قائد عوام ۵۸ برس قبل یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ: حالیہ رجحانات تو نیکی کی حدود سے آگے نکل گئے ہیں۔" اور یہ سوال آج بھی جوں کا توں موجود ہے۔ جس کی گونج قائد ذہن میں چکر کاٹ رہی تھی کہ: "یہ ترقی ہے کہ تنزل!"

اس کے بعد قائد عوام پاکستان چلے آئے۔ پھر جب ان کی امریکہ روانگی ہوئی، وہاں پر قیام پذیر ہوئے تو ان کے روح کی تڑپ پھر سے انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھی، وہ پھر سے اضطراب اور بیقراری کے راہوں میں بھٹکنے لگے، انہیں یہ دنیا ظالم نظر آنے لگی۔ ان کو محسوس ہوا یہ دنیا ایک مخصوص دائرہ میں پھر رہی ہے اور دکھ انسان کا مقدر بن چکا ہے۔ ایسے خیالات کا اظہار انہوں نے اپنی تحریر "نوح انسانی کی آفاقیت" میں کیا ہے۔ جو کہ انہوں نے یونیورسٹی آف کیلی فورنیا۔ برکلے میں ۱۲ نومبر ۱۹۷۸ء کو تحریر کی۔ وہ کہتے ہیں:

"یہ دنیا بڑی ہی ظالم ہے۔ زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے جب کوئی شخص بخشش کی خوشبو سے لدی ہوئی فضا میں ہر سانس کے ساتھ تازگی محسوس کرتا ہے اور ایسے لمحات میں بھی جب کثرت جذبات کا زہر اس کے ذہن میں اس حد تک سرایت کر جاتا ہے کہ وہ ساری مخلوق میں اسفل ترین محسوس کرنے لگتا ہے اور ایسے اوقات بھی آتے ہیں، جب دنیا مزاحمت سے عاری چرخی پر تیزی سے گردش کرتی دکھائی دیتی ہے اور بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے غم واندوہ انسان کا مقدر بن چکا ہے۔"

www.bhutto.org

یہ خیالات کسی عام آدمی کے نہیں ہیں، جو کہ ایک چھوٹا موٹا کاروبار کر کے اپنے کنبہ کی گاڑی چلاتا ہو اور اپنے بیوی بچوں کی پرورش کرتا ہو۔ یہ خیالات اور یہ غم کی کیفیت اس اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل نوجوان کی تھی، جس کو آگے چل کر اپنے ملک اور وہاں کے عوام اور ساری دنیا کی ترقی اور خوشحالی، آزادی اور امن کیلئے بہت کچھ کرنا تھا۔

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا رنگ بدلتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان بدلتا ہے، کیونکہ یہ دنیا انسان سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ انسان کے بہت سارے روپ ہیں، اسے فرشتے کے روپ میں دیکھا گیا ہے تو شیطان کے روپ میں بھی۔ کبھی کبھی تو یہ دونوں روپ اکٹھے ہی ایک انسان کے اندر پائے جاتے ہیں۔ جب وہ انسان پر سوچتے تھے تو ان پر انسان کے بہت سے روپ عیاں ہوتے تھے، ہر روز بدلتی صورت انسان ان کیلئے باعث اندوہ تھی، انہیں محسوس ہوتا تھا کہ انسان کسی بڑے روگ میں مبتلا ہے:

''یہ کون سا ان عارضہ ہے جو ایک سوموار کو حضرت انسان کو حیوان کا روپ دیتا ہے۔ اگلے دن اسے عظمت بخشتا ہے۔ بدھ کو اسے وحشی بنا دیتا ہے۔ جمعرات کو اسے مسیحا بننے پر اکساتا ہے۔ جمعہ کو اس میں افلاطون کی جھلکیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ہفتہ کے دن وہ قدرے میکاولی کے کردار کا مظہر بن جاتا ہے اور پھر اتوار آ جاتا ہے جس دن حلقہ کلیسا کے کسی کمرے میں کفارے کی عبادت کا اجتماع پوری شان و شوکت کے ساتھ نظر آتا ہے۔''

نوعمر ذوالفقار علی بھٹو کے ذہن میں اس قسم کے خیالات آتے رہے۔ وہ بنی نوع انساں کو اس روپ بدلنے کے عارضہ سے نجات دلانے کیلئے سوچتے تھے۔ چنانچہ وہ انسانیت کے تصور اور اس کے خدوخال پر سوچنے لگے، انہیں محسوس ہوا کہ مساوات اور آزادی کے سوائے انسانیت کا تصور محض ایک اصطلاح ہے۔ اس نقطے پر انسان دوست ذوالفقار علی بھٹو نے یہ پیغام دیا:

''ماضی کے تکلیف دہ تجربات اس امر کے متقاضی ہیں کہ ہم انسانیت کو ایک واحد اور ناقابل تقسیم تنظیم قرار دے کر غور و فکر کریں، ہم سب اپنے نسلی اور ثقافتی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کو اس مقدس وحدت کا کارکن سمجھیں اور عوام الناس کو مسرت بخشنے کیلئے جان کی بازی لگا دیں۔ ان سیدھے سادے عوام کیلئے، جن کے پاس نہ دھن دولت ہے، نہ اختیار، ہم ہر قسم کے ذہنی

www.bhutto.org

خوف و ہراس سے مبرا ہوا ، ، ہماری روحیں ہمت شکنی کا شکار نہ ہونے پائیں۔ صرف اس صورت میں زندگی با مقصد اور معنی خیز محسوس ہوگی ، یہ وقت جب ہم عزم صمیم سے اپنے شکستہ حال لوگوں کو قعرِ مذلت سے نکال کر موجودہ جنت تک پہنچائیں۔''

بھٹو صاحب شروع سے شکستہ حال عوام اور ان کی زندگی کو ترقی و خوشحالی سے ہم کنار کرنے کی طرف مائل تھے۔ وہ ان انسانوں کا ہمدرد اور ساتھی بننا چاہتے تھے، جن کے پاس نہ کوئی مال و متاع تھا نہ کوئی دولت، انہی لوگوں کی حالتِ زار کو ایک گلزار بنانا چاہتے تھے۔ اسی زمانے سے، جب وہ ابھی طالبِ علم تھے، عوام الناس کی مسرت و شادمانی کیلئے جان کی بازی لگا دینے کو ترجیح دیتے تھے، بعد میں انہوں نے یہ کر کے دکھایا، وہ عوام کے سکھ اور خوشی کیلئے لڑتے رہے، یہاں تک اپنی جان کا عظیم نذرانہ پیش کیا۔

اس مضمون میں آگے چل کر انہوں نے انسانیت کیلئے فلاح کا راستہ اختیار کرنے کا درس دیا، خدا کی اس زمین سے دکھ، افلاس، بدحالی اور غربت کے خاتمے کی جدوجہد میں یک مشت ہو کر دل و جان سے شریک ہونے کا پیغام دیا:

''ہماری اصلاح انسانیت کی فلاح سے وابستہ ہے، کیونکہ ہم اس کا اٹوٹ انگ ہیں۔ ہماری کامرانیاں سب کیلئے ہونی چاہئیں، کیونکہ یہ دنیا سب کیلئے بنائی گئی ہے۔ ہم خواہ کسی بھی سرزمین پر رہتے ہوں لوگ جہاں کہیں بھی حقوق کیلئے نبرد آزما ہوں اور جہاں جہاں بھی وہ انصاف و صداقت کے حصول کیلئے جدوجہد کر رہے ہوں، آپ بھی ان کے ساتھ پوری گرمجوشی اور دل و جان سے شریک ہو جائیں جب بھی انسان ستم، لغزش یا بے انصافی یا ظلم و استبداد کا شکار ہو جائے تو پھر کسی خوف و خطرہ کے بغیر جدوجہد اور ایثار کا علم بلند کر کے جہاد کا آغاز کر دیجئے۔ آدمی آزاد بھی ہوتے ہیں اور غلام بھی، امیر بھی ہوتے ہیں غریب بھی، لیکن انہیں اللہ تعالیٰ کی اس زمین سے دکھ اور غربت کے خاتمے کیلئے متحد ہونا چاہیے۔''

آپ محسوس کر سکتے ہیں یہ ایک واضح طور پر عالمی مساوات و برادری کا پیغام ہے۔ انسان کی نجات کا ایک لائحہ عمل ہے۔ گو کہ نسلِ انسانی میں تنظیم آج بھی ایک بے قرار خواب کی مانند ہے۔ یہ دنیا زمین سے دکھ اور غربت کے خاتمے کیلئے اتحاد سے کوسوں دور کھڑی ہے، لیکن پھر بھی، اس حقیقت

www.bhutto.org

سے کون انکار کرسکتا ہے کہ انسانیت کی اصلاح کی جڑیں اس کی فلاح و بہبود میں پیوستہ ہیں، یہی ہمارے قائد آج سے چھ دہائیاں پہلے فرما رہے تھے۔

اپنی بات کو آگے لے جانے سے پہلے ہمیں اس بات پر واضح ہونا چاہیے کہ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو زمانہ طالب علمی سے گہری سوچ بچار کے عادی تھے، وہ انسان کی فلاح و بہبود کیلئے فکر مند رہتے تھے اور اپنا کردار ادا کرنے کیلئے کوشاں رہتے تھے۔ شروع سے ہی وہ عوام کے سکھ، خوشی اور مسرت کیلئے جان کی بازی لگانے کی طرف راغب تھے۔ ابتک جن تحاریر کو ہم بحث کا موضوع بنا چکے ہیں، ان میں مدبرانہ ذہن سے عالمگیریت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ان تحریروں سے یہ بات بھی معلوم پڑتی ہے کہ صاحب قلم کو اپنے موضوع پر بڑی دسترس حاصل ہے، اس کے ساتھ بیان اور زبان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ یہ خیالات کی صفائی اور تصورات کی ہمہ گیریت ایک ایسے مدبر کے بیدار دماغ کی پیداوار ہے، جو کہ ابھی طالب علم تھا۔ ادیبانہ لب ولہجہ میں ڈوبی ہوئی یہ تحریریں، جن خیالات وتصورات اور خوابوں پر مبنی ہیں، ان کو بعد میں قائد عوام حقیقت کا روپ دینے کیلئے جہد مسلسل میں سرگرم عمل رہے، اپنے عوام دوست اور عالمگیر خیالات وتصورات کی وجہ سے وہ ایک نظریہ بن چکے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ فرد مرا کرتے ہیں، نظریے زندہ رہتے ہیں۔

آپ کی یاددہانی کیلئے ملاحظہ ہو کہ ہم آج ذوالفقار علی بھٹو کی مدبرانہ اور ادیبانہ حیثیت کا احاطہ کررہے ہیں، اس سلسلے میں ہم نے ان بنیادی تحریروں کو موضوع بحث بنایا ہے، جو کہ ان کی ادیبانہ حیثیت کو اجاگر کرتی ہیں اور ایک مخصوص دور کو حصار میں لئے کھڑی ہیں۔ ان تحریروں میں بے پایاں بیقراری ہے، ایک بیکراں تڑپ ہے اور بیتابی اور دکھ کا پیرہن تار تار ہے اور سکھ کی رفوگری کی خواہش ہے۔ عالمی تہذیب وتمدن کی جھلکیاں ہیں، دور ماضی کے اچھے دنوں اور حال کی نامہربانیوں اور سرد مہری کا امتزاج ہے۔ مطلب کہ ایک صلاحیتوں سے مالا مال ذہن اور حساس دل پر جو بھی بیتی، اس کا بے ساختہ اور بے نیاز اظہار ہے۔

یہاں سے ہم ایک قدم آگے ان تحریروں کی طرف چلتے ہیں، جو کہ سنجیدہ نوعیت کی ہیں اور پیچیدہ مسائل کو موضوع بنائے ہوئی ہیں۔ ان تحریروں سے قائد عوام کی مدبرانہ حیثیت، بے پناہ مطالعہ اور مسائل کا نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ ان سنجیدہ مدبرانہ مقالہ جات کا تعلق اس

www.bhutto.org

زمانے سے ہے جب قائد عوام اپنی تعلیمی سرگرمیاں ختم کرنے کے بعد وطن واپس ہوئے تھے۔ اس زمانے کی بابت احمد سلیم نے ''بھٹو کے مقالات'' کے دیباچے میں کچھ یوں لکھا ہے:

''۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک کا عرصہ انہوں نے بیرون ملک اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں گزارا۔ کیلی فورنیا کی یونیورسٹی برکلے سے سیاست میں گریجویشن کرنے کے بعد بھٹو نے ۱۹۵۲ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے کرائسٹ چرچ کالج سے فلسفہ قانون میں اعزاز کے ساتھ ایم اے کیا۔ ۱۹۵۳ء میں انہیں لندن کے ''لنکن ان'' میں پیشہ وروکالت کیلئے نامزد کیا گیا اور ساؤتھمپٹن یونیورسٹی میں وہ بین الاقوامی قانون کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ پاکستان واپسی پر انہوں نے سندھ مسلم لاء کالج کراچی میں دستوری قانون پڑھانے کا آغاز کیا۔ اسی دوران (۵۸-۱۹۵۴ء) وہ ہائی کورٹ میں بطور بیرسٹر وکالت بھی کرتے رہے۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء میں جب وہ پاکستان پہنچے تو یہاں سیاسی اور مادی مفادات کیلئے غیر اخلاقی اور مجنونانہ دوڑ دھوپ شروع ہو چکی تھی، انہوں نے سنجیدگی سے حالات کا جائزہ لیا اور آمرانہ روش کے برعکس جمہوری اداروں کے استحکام کیلئے نظریاتی تحریروں سے اپنے کام کا آغاز کیا، ۵۶-۱۹۵۴ء کے دوران انہوں نے ''ویژن'' میں جتنے بھی مضامین لکھے، ان میں انہوں نے اس واحد نقطہ پر زور دیا کہ آئینی نظام اور قانون کی بالادستی فائق ہوتی ہے..... اپنے اس دور کی تحریروں میں انہوں نے ون یونٹ کی بھی کھلی مخالفت کی..... مئی ۱۹۵۴ء میں انہوں نے کراچی کے ایک جریدے ''ویژن'' میں آئینی روایات کے موضوع پر اپنا پہلا مقالہ سپرد قلم کیا۔''

۵۸-۱۹۴۸ء کا دور سیاسی ہنگامہ آرائیوں کا دور تھا، جن پر قائد عوام گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کی اس دور کی تحریروں میں حیرت انگیز پولیٹیکل ویژن کا اظہار ہے۔ یہ دس برس پاکستان میں حکومتی اور انتظامی بحران کے حوالے سے اہم مانے جاتے ہیں۔ یہ بات آپ کیلئے شاید حیرانگی کا باعث ہو کہ اس دور میں اسمبلیاں تو موجود تھیں، لیکن آئین ناپید تھا، قائد عوام اس فقدان سے باخبر تھے اور مدبر اور ایک قانوندان کی حیثیت سے انہوں نے اپنا یادگار مقالہ ''پاکستان ایک وفاق یا وحدانی ریاست'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ آئینی مسئلے سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے چند بنیادی باتوں کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے وہ ہمیں آئینی اصطلاحات کی تشریح سمجھاتے ہیں، تشریحات سے پہلے موضوع کی تمہیدیوں باندھی گئی ہے:

www.bhutto.org

''برصغیر کی تقسیم سے قبل ہی پاکستان کے آئین کی تشکیل کے کام سے ''وفاقی'' اور ''وحدانی'' اصطلاحیں منسوب رہیں ہیں، تاہم وفاقی آئین کے تقاضے جغرافیائی حالات اور ثقافت اور تاریخ کی گمشدہ کڑیوں سے دوچند ہوجاتے ہیں، اگرچہ مقامی تقاضوں کے حقائق کے باوجود ایک چھوٹے مگر مؤثر طبقے نے حال ہی میں وحدانی حکومت کیلئے جوش و ولولہ کا اظہار کیا ہے۔ اس بنیاد پر کہ اس طرز حکومت سے صوبائی عصبیت کے مکروہ اور روح کش زہر سے چھٹکارا حاصل ہوجائے گا۔''

اس کے بعد وہ آئینی اصطلاحات کی طرف آتے ہیں اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے منفرد تاریخدان کے-سی-وہیئر کے حوالے سے وفاقی اصول کا مطلب سمجھاتے ہیں:

''اختیارات کی تقسیم کا طریقہ جس میں مرکزی اور علاقائی حکومتیں اپنے اپنے دائرے میں رہ کر خودمختیار بھی ہوں اور اشتراکِ عمل بھی کریں۔''

اس کے بعد وہ وحدانی اصول یا وحدانی طرز حکومت کی تشریح کرتے ہیں اور بتاتے ہیں، کہ اگر ایسی حکومت کیلئے تیار کردہ آئین کیسا ہوتا ہے:

''وحدانی آئین میں بالادستی مرکزی اور مقامی حکومتوں میں تقسیم نہیں ہوتی بلکہ غیر منقسم طور پر مرکز کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور علاقائی حکومتیں اگر موجود ہوں بھی تو مرکزی حکومت کے معاون کار کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ذیلی طور پر ہوں گی۔ اس طرح وحدانی مملکت میں مرکزی اور مقامی حکومتوں کے مابین کوئی اشتراکِ عمل نہیں ہوتا، صرف ایک حکومتی ذریعہ ہوتا ہے، جس کو سبھی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔''

ان بنیادی تشریحوں کے بعد وہ دونوں طرز حکومت کے مابین فرق بیان کرتے ہیں، اور کہتے ہیں:

''پہلے نظریہ (وفاقی اصول) کے حامی اصحاب کی دلیل یہ ہے کہ وفاق کی چند واضح خصوصیات ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے علاقائی حکومتوں کی قیمت پر مرکزی حکومت کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ مدات جن سے علاقائی خودمختیاری کم ہوتی ہے، لامحالہ مرکزی حکومتوں کے قبضے میں ہوتی ہیں، لہٰذا قانون کی مرکزیت ناگزیر ہے۔ مرکزی حکومتیں ملکی تحفظ کا انتظام کرتی ہیں اور انہیں جنگ کرنے اور امن قبول کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ ایسی حکومت جس کو اس قدر مرعوب کن اختیارات

www.bhutto.org

حاصل ہوں، خصوصیت سے مالیات کی سلسلے میں، علاقائی حکومتوں کو کمزور کر دیتی ہے۔"

ایک ریاست جس کو مختلف اکائیاں تشکیل دیتی ہوں، وہ کس طرح اپنے آپ کو مضبوط اور برقرار رکھ سکتی ہے۔ اس نقطے کو بھٹو صاحب اسٹالن کے حوالے سے اجاگر کرتے ہیں، جس نے کہا تھا:

"ایک ریاست کی صورت میں لوگوں کا انضمام اس وقت تک پائیدار نہیں ہو سکتا جب تک لوگ رضا کارانہ طور پر اس قسم کا فیصلہ خود نہ کریں۔ اسی وجہ سے ہر اکائی اپنا آئین رکھتی ہے جو وفاقی آئین سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے علاقے کے حدود و اربعہ میں اس کی اجازت کے بغیر ردوبدل نہیں کیا جا سکتا اور یہ حق اسے حاصل ہے کہ وہ آزادانہ طور پر متحدہ ریاست ہائے روس کی جمہوریہ سے الگ ہو جائے۔"

وفاق اور وحدتوں کے مابین رشتے کی ایک مثبت تصویر اوپر دیئے گئے حوالے سے واضح ہے۔ یہاں پر وفاقی اور وحدانی مملکت کی آسان تشریح یہ ہے کہ وحدانی طرز حکومت ون یونٹ تھا، جس کے نفاذ سے پاکستان کی وفاقی حکومت میں تمام اکائیوں کی حیثیت ختم کر دی گئی تھی۔ ہمارے قائد نے اس قسم کی حکومت کے خلاف اسی مقالے میں کہا تھا کہ جغرافیائی حدود بیک جنبشِ قلم سے مٹائی جا سکتی ہیں مگر ثقافتی امتیاز کا صفایا قانون سازی یا انتظامی ضوابط سے ممکن نہیں۔

آپ پر واضح ہو کہ یہ یادگار مقالہ تحریر کرنے کی قائد کو اس لئے ضرورت محسوس ہوئی، کہ وہ جان چکے تھے کہ ارباب اختیار وحدانی قسم کی حکومت مسلط کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، جب یہ مقالہ لکھا جا رہا تھا تو ون یونٹ نافذ کرنے کی تیاریاں کی جا چکیں تھیں انہوں نے اس نازک مرحلے پر پر مغز اور دلائل سے بھرپور مقالہ لکھا، وہ مطلق العنانیت کے بل پر اس تضاد کا حل نہیں چاہتے تھے۔ ۲۳-اپریل ۱۹۵۴ء کو سابقہ وزیر اعلیٰ پنجاب ممتاز دولتانہ نے کہا تھا کہ:

"میں نے پاکستان کیلئے ہمیشہ وحدانی طرز حکومت کی وکالت کی ہے اگرچہ میں اقلیت میں رہا۔"

انہوں نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا، بلکہ وفاقیت کے موضوع پر اپنا پورا فن پیش کر دیا کہ:

"جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نے ہمیشہ کنفیڈریشن یا عملی طور پر اس کے قریب ہر طرز حکومت کی مخالفت کی ہے۔ ایک صوبے کے زر مبادلہ کو صرف اسی صوبے کے استعمال کیلئے مختص کرنے

www.bhutto.org

کا مسئلہ اور صوبے سے متعلق مرکزی ملازمتوں کو اسی صوبے کے شہریوں تک محدود کرنا اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جتنی یہ تجویز کہ پنجاب کی سپاہ صرف پنجاب کے دفاع کیلئے استعمال ہو یا یہ کہ ایک صوبے کی وسائل اور آبادی کی مدد سے جو پبلک فنڈ جمع ہو جائے وہ صرف اس صوبے یا علاقے کی مفاد میں صرف کیا جائے۔ میرے خیال میں اس قسم کی محدود صوبائیت پاکستان کے صوبوں اور ہمارے عظیم خطہ ارض دونوں ہی کی بہبود کیلئے تباہ کن ہے۔"

اگرچہ ممتاز دولتانہ نے اپنے آپ کو اقلیت میں شمار کیا تھا، لیکن حقیقت یہ تھی وہ اس خیال کو ماننے اور اس پر عمل درآمد کی خواہش رکھنے والے اکیلے آدمی نہیں تھے، یہ سوچ اس وقت کی پوری تنگ نظر سیاسی قیادت کی ذہنی عکاسی کرتی ہے۔ دولتانہ صاحب کی اس رائے پر ہمارے قائد نے اپنی رائے کچھ یوں دی ہے:

"وفاقیت سے متعلق اس (ممتاز دولتانہ کی رائے) سے زیادہ غلط رائے نہیں مل سکتی، تین غیر معمولی مہینوں کے دوران اس طرح کی خطرناک حد تک غیر فطری اور سادہ تشریحوں کی وجہ سے ایک بہت کا یا پلٹ سامنے آئی ہے۔"

انہوں نے وحدانی حکومت کی مخالفت کرتے ہوئے علی الاعلان کہا کہ:

"اس نئے منصوبے (ون یونٹ) کو مرتب اور پیش کرنے والوں نے عمومی اور مبہم پروپیگنڈے کے ذریعے یہ شور بلند کیا کہ مغربی پاکستان کو ون یونٹ میں پرونے سے صوبائی تعصب کا خاتمہ ہو جائے گا اور قومی اخراجات میں کمی واقع ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے انتشار کی صورت پیدا ہوگی۔"

قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو موجودہ حالات کے پیش نظر آئندہ رونما ہونے والے ہولناک واقعات کی اپنے تصور میں تصویر دیکھ رہے تھے۔ وہ صاحب فہم و فراست تھے۔ صاحب علم و بصیرت تھے۔ انہوں نے اس تحریر میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ ون یونٹ مغربی پاکستان کو ایک اکائی میں پرو نہیں سکتا، یہ ایک خطرناک منصوبہ ہے جس سے سوائے انتشار کے اور کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ وہ اس تجویز کو ۱۹۴۰ء کی تاریخی قرارداد کے منافی سمجھتے تھے۔ اس وحدانی طرز حکومت یعنی ون یونٹ خلاف انہوں برملا اظہار کیا کہ:

www.bhutto.org

''مغربی پاکستان کو ایک وحدت میں پرونے سے ۱۹۴۰ء کی تاریخی قرارداد اور قرارداد مقاصد کی نفی ہوگی، ریاست کشمیر اگر کبھی پاکستان میں شامل ہوئی تو یہ تجویز اس کیلئے بھی ناقابل قبول ہوگی۔''

یہ مقالہ اس دور کے سیاسی حالات کا اک منظر نامہ ہے اور پاکستان کے مستقبل کیلئے کی گئی پیش گوئی کی ایک واضح اور ٹھوس دستاویز ہے۔ اس مقالے میں لکھی گئی کچھ باتیں الہامی پیش گوئی کا درجہ رکھتی ہیں۔

یہی وہ مقالہ ہے جس میں انہوں نے یہ تاریخی جملہ سپرد قلم کیا تھا کہ:

''اب قوم کسی ایسے مسیحا کی منتظر ہے، جو اس بنجر سرزمین کو زرخیز رنگینی میں تبدیل کردے۔''

تاریخ نے ثابت کیا کہ جملہ انہوں نے لاشعوری طور پر اپنے لئے ہی لکھا تھا۔ پاکستانی سیاست میں بانی پاکستان قائداعظم کے بعد اعلیٰ اور بے مثال کردار ادا کرنے کیلئے تاریخ نے ان کا ہی انتخاب کیا تھا۔ اور یہ انتخاب پاکستان کے محروم، محکوم اور اقتدار اعلیٰ سے دور بسنے والی مخلوق کیلئے خوشی کی ایک نئی نوید بنا۔ نظر انداز کئے ہوئے عوام کو یہ پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ حکومت دراصل انہیں کے امنگوں اور خواہشوں سے تشکیل پاتی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام اور بھٹو دور حکومت شروع ہونے کی بعد مخلوق خدا پر یہ راز افشا ہوا کہ طاقت کا سرچشمہ دراصل وہی ہیں۔

بہر حال یہاں سے ایک قدم اور آگے چلنے سے پہلے یہ بات ضرور گوش گزار کرنا چاہوں گا، کہ جب شہید بھٹو اقتدار پر آئے تو انہوں نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ انہوں نے ایک باضابطہ آئین تشکیل دیا، جس پر تمام اہم سیاسی اور تو پرست جماعتوں نے اپنی رضامندی ظاہر کی، یہ وفاقی نوعیت کا آئین بذات خود وحدانی حکومت کی نفی تھا اور اس میں عوام کے ساتھ ساتھ صوبوں کے حقوق و اختیارات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا۔ وہ زمانہ ایک عظیم بحران کا زمانہ تھا، ملک دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا، باقی ماندہ ملک کو چلانے کیلئے اقتدار پیپلز پارٹی کے حوالے کیا گیا تھا۔ ایک نئے نظریہ کے تحت ایک نئے جمہوری اور اقتصادی دور کی بنیاد ڈالی جارہی تھی اور اس سلسلہ میں باقاعدہ کوششیں جاری تھیں۔ ۱۹۷۳ء کا آئین وفاق اور صوبوں کے درمیاں اختیارات کا تعین کرتا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا

www.bhutto.org

جاتا ہے کہ اس باضابطہ آئین میں صوبوں کے اختیارات کا کوئی تعین نہیں کیا گیا۔ یہ بات کہنے والوں نے شاید آئین کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ دراصل اس دور کے بحران کے پیش نظر آئندہ دس سالوں میں صوبوں کو مکمل اختیارات منتقل ہونا تھے۔ لیکن اس سے پہلے بھٹو حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر زبردستی قبضہ جمالیا اور ۹۰ دن کیلئے اقتدار پر آیا اور گیارہ برس تک اس پر قابض رہا۔ اس لئے کنکرنٹ لسٹ میں شامل صوبائی اختیارات کی فہرست جس کو بتدریج صوبوں کی جانب منتقل ہونا تھا، وہ نہ ہوسکی۔ آئین کے مطابق دس سال گزرنے کے بعد یہ اختیارات خود بخود صوبوں کو منتقل ہونے تھے، جن پر مزید کسی کارروائی کی ضرورت نہ تھی، لیکن یہ نہ ہوسکا اور وفاق اور صوبوں کے مابین اختیارات پر تضاد آگے بڑھتا رہا، اب تک یہ ٹکراؤ ایک بہت ہی سنگین مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کے درمیان طے پانے والے "میثاق جمہوریت" میں اس بات پر اتفاق رائے قائم کیا گیا ہے کہ کنکرنٹ لسٹ ختم ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں حال ہی میں پیپلز پارٹی کی جانب سے قومی اسمبلی میں کنکرنٹ لسٹ کے خاتمے کے متعلق بل جمع کردیا گیا ہے۔

آپ میں سے بہت سارے احباب ملک کی سیاسی تاریخ کی بابت مجھ سے بہتر جاننے والے ہونگے، اور بہتر کہنے والے بھی ہوں گے۔ میں یہاں صرف بات کو آگے بڑھانے کیلئے قائد کے اگلے مقالے "آئینی لوازمات" میں موجود بحث کو آپ تک پہنچانے کیلئے مذکورہ مقالے کے رقم ہونے تک پاکستان کی آئینی روایات کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کروں گا۔ قیام پاکستان کے وقت ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو کچھ ترمیمات کے ساتھ بطور عبوری آئین ملک میں نافذ کیا گیا۔ جس کے تحت پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا قیام عمل میں لایا گیا، اس اسمبلی کے ذمہ دو کام تھے۔ اول یہ کہ اسے ملک کیلئے نیا آئین مرتب کرنا تھا اور دوسرا یہ کہ اسے بطور ملکی پارلیامنٹ انتظام چلانا تھا۔ اس ضمن میں گورنر جنرل کو ملک کے انتظامی سربراہ کی حیثیت دی گئی تھی۔ اس طرح پہلی آئین ساز اسمبلی برسر اقتدار آئی اور ملک میں پارلیامانی طرز حکومت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس اسمبلی کے سپرد انتہائی اہم کام کیا گیا تھا، کیونکہ آئین سازی بہت ہی مشکل کام تھا، اس سلسلے میں گہری سوچ بچار اور تردد کی ضرورت تھی۔ اس اسمبلی کا کارنامہ صرف 'قرارداد مقاصد' تھی، جس میں آئین کیلئے بنیادی اصول مرتب کئے گئے تھے اور کہا گیا تھا کہ ملک میں اسلامی قوانین کی

www.bhutto.org

مطابقت سے جمہوریت، آزادی، مساوات اور معاشرتی انصاف پر توجہ مرکوز کی جائے گی۔ مزید برآں عدلیہ کی آزادی کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ قرارداد مقاصد میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وفاقی طرز حکومت رائج کی جائے گی۔ قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد آئین کے مختلف معاملات اور امور طے کرنے کیلئے مختلف کمیٹیاں تشکیل دیں گئیں، جن میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی اہم ہے۔ اس کمیٹی میں تمام جماعتوں کو نمائندگی دی گئی تھی۔ اب اس کمیٹی کی ذمہ داری یہ تھی کہ قومی مفادات کے پیش نظر ایسے اصول وضع کرے، جن کی اساس پر نیا آئین تشکیل دیا جائے۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی، جس میں ملکی پارلیامنٹ کے ایوان قائم کرنے کی سفارش کی گئی، لیکن پھر ہنگامہ آرائی شروع ہوگئی تو اس وقت کے وزیراعظم نے رپورٹ پر نظرثانی کا وعدہ کیا، بعد میں انہیں ۱۹۵۱ء میں شہید کیا گیا۔ اس کے بعد خواجہ ناظم الدین نے آئین سازی کے کام کو آگے بڑھایا، آخر کار ۱۹۵۲ء میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے اپنی سفارشات مکمل کرلیں کہ ملک کا صدر مسلمان ہوگا، جس کا انتخاب دونوں ایوان پارلیامنٹ کریں گے اور دونوں ایوانوں میں ایک جیسی اسمبلیاں قائم ہوں گی، دونوں ایوانوں کے اختیارات برابر ہوں گے۔ پھر تنقید کا طوفان کھڑا ہوگیا، کہا گیا کہ ایک جیسی نیابت کی سفارش وفاقی اصولوں کے منافی ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کے کسی صوبے کو اپنے حق میں کر کے اجارہ داری قائم کرسکتا ہے۔ یہ بھی اعتراض کیا گیا کہ اختیارات کی تقسیم کا فارمولا نامکمل ہے۔ یہ اعتراض مشرقی پاکستان نے کیا تھا۔ اس موقع پر ایک بار پھر حکومتی بحران پیدا ہوا اور گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو ہٹا کر محمد علی بوگرہ کو وزیراعظم مقرر کیا۔

جب قائد عوام ''آئینی لوازمات''، مقالہ لکھ رہے تھے، تب تک مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین تضادات کھل کر سامنے آگئے تھے۔ جس کی وجہ سے آئین سازی کا مرحلہ رک سا گیا تھا، چونکہ یہ معاملہ انتہائی بنیادی اہمیت کا حامل تھا، اس لئے اس مسئلے پر بھٹو صاحب نے قلم اٹھایا، وہ سمجھتے تھے جب تک آئین باضابطہ طور پر نافذ نہیں کیا جاتا تب تک سیاسی تنازعات کا حل ہونا ناممکن ہے۔ بھٹو صاحب اپنے مضمون کی شروعات گورنر جنرل غلام محمد کے اس اعلان سے کرتے ہیں، جس میں اس نے خواجہ ناظم الدین کی آئین ساز اسمبلی کیلئے کہا تھا کہ وہ مزید کام نہیں کرسکتی:

''۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو گورنر جنرل پاکستان نے حسب ذیل اعلان جاری کیا: گورنر جنرل

www.bhutto.org

ملک کو درپیش سیاسی بحران پر غور و فکر کے بعد بڑے افسوس کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آئینی مشنری ناکارہ ہو چکی ہے۔ اس لئے انہوں نے پاکستان بھر میں ہنگامی حالات کے اعلان کا فیصلہ کیا ہے۔ آئین ساز اسمبلی اپنی موجودہ حیثیت میں عوام کا اعتماد کھو چکی ہے۔ لہٰذا وہ مزید کام جاری نہیں رکھ سکتی۔"

اس اعلان نے آئینی مسئلے کی اہمیت کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ بھٹو صاحب نے اپنے مضمون کی شروعات انارکسٹوں سے کرتے ہیں، جن کے خیال کے مطابق قانون وضع کرنے کا عمل ایک برائی ہے۔ جس کی بنیاد پر ریاست افراد کو غیر فطری طور پر اپنا مطیع و غلام بنا لیتی ہے۔ وہ انارکسٹوں کے اس خیال کی نفی کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں:

"فلسفہ قانون کے تجزیاتی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قوانین مملکت کے ستون ہیں اور آئین، جو کہ اعلیٰ ترین قانون ہے، مملکت کی اساس ہے، جس سے ریاست اپنا وہ قانونی جواز حاصل کرتی ہے، جو ایک ایسا قانونی شخص ہے، جہاں سے ریاست بین الاقوامی برادری میں اپنے فرائض و حقوق کے ساتھ وجود میں آتی ہے۔"

کسی بھی مملکت کیلئے آئین ایک بنیادی چیز ہے، آئین فرائض و حقوق کا تعین کرتا ہے۔ پاکستان کا اس مضمون کے لکھتے وقت المیہ یہ تھا، کہ اس کے پاس کوئی باضابطہ آئین نہیں تھا، قائد عوام نے اس کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا، گو کہ وہ اس وقت تک باقاعدہ سیاست کا حصہ نہیں بنے تھے، پھر بھی ان کے اندر ایک سیاسی اور آئینی مفکر اور مدبر جاگ رہا تھا، اسی سبب انہوں نے آئین کے مسئلے پر اپنے قلم کو جنبش دی، کیونکہ وہ آئین کے بغیر کسی ریاست کے تصور یا وجود کو بے معنی سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آئین ایک بنیاد معیار ہے۔ اور آئین سے دستبرداری یا محرومی کو ریاست کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے مترادف سمجھتے تھے۔ وہ ۱۹۴۷ء اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے بجائے ایک نیا آئین دیکھنا چاہتے تھے۔ اس مضمون میں انہوں نے اس وقت ارباب اختیار و اقتدار کو بتایا تھا، کہ آپ آزادئ ہند کے قانون کا سہارا لینے کے پابند نہیں ہیں۔ آپ کیلئے اپنا ایک آزادانہ راستہ موجود ہے، اس قانون کی تنسیخ سے پاکستان ختم نہیں ہوگا، کیونکہ قانون آزادئ ہند کا سیکشن ۶ (۴) خود کہتا ہے کہ:

www.bhutto.org

''برطانوی پارلیامنٹ کا کوئی قانون، جو مقررہ دن یا اس کے بعد منظور کیا جائے، کسی طور دونوں نئی ریاستوں میں سے کسی کے بھی قانون کے جزو کے طور پر محیط نہیں ہوگا، بجز اس کے کہ ان ریاستوں کی مقننہ ایک قانون کے تحت اسے نافذ العمل قرار دے۔''

وہ ایک نئی راہ دکھا رہے تھے اور پرانے راستے سے رابطہ منقطع کرنے پر زور دے رہے تھے۔ وہ ایک نئے آئین کے طرفدار تھے، کیونکہ وہ آئین اور ریاست کو لازم وملزوم سمجھتے تھے۔ آئینی مسئلے پر وہ اپنے وسیع مطالعہ اور خداداد بصیرت کی بناء پر بڑی حد تک کلیئر تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مدبرانہ خیالات اس دور (۱۹۵۴ء) کے سیاسی وحکومتی طبقات اور حلقوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ آئین کی تشکیل، ایک نسل کو نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کو سامنے رکھ کر کی جائے۔ ایسے نسلوں پر محیط آئین کیلئے وہ ذیل درج قوانین کی پابندی لازم قرار دیتے ہیں:

''(۱) اسے (آئین کو) عوام کی شخصیت اور مرضی میں ہم آہنگی ہی سے مرتب کرنا چاہیے۔

(۲) اسے اپنی لچک برقرار رکھنی چاہیے۔

(۳) اسے صرف لازمی معیاروں تک محدود رہنا چاہیے۔''

دوستو! ذوالفقار علی بھٹو کے اس مضمون 'آئینی روایات' جو کہ زیر بحث ہے، سے آپ یہ اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ وہ ۱۹۷۳ء کا آئین ترتیب دینے میں کامیاب کیوں ہوئے! اس نقطے پر آپ کہہ سکتے ہیں ذوالفقار علی بھٹو بنیادی طور پر ایک سیاسی مدبر اور ماہر قانون تھے۔ ان کو پہلے معلوم تھا کہ آئین کیا چیز ہوتی ہے، اسے کس طرح ترتیب دیا جاتا ہے اور اس کا جوہر حقیقی کیا ہوتا ہے، وہ اس ضمن میں کہتے ہیں:

''ایک آئین اپنی نوعیت کے لحاظ سے وفاقی اور وحدانی ہو سکتا ہے۔ اس میں عدلیہ کی آزادی کا اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے، عدلیہ کی آزادی کو سلب کیا جا سکتا ہے۔ یہ انتظامات کا منبع صدر یا وزیراعظم اور اس کی کابینہ کو قرار دے سکتا ہے، حتیٰ کہ یہ انتظامیہ کی پوری تفصیل مہیا کر سکتا ہے، لیکن اس کی شقیں اور دفعات خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہوں، اسے اس وقت تک اچھا آئین نہیں کہا جائے گا جب تک کہ اس کی ہیئت لیون ڈوگیوٹ کے بقول عوام کے معاشرتی استحکام کے منافی ہے۔''

www.bhutto.org

بھٹو صاحب عوام کے معاشرتی استحکام کی بات، وہ بھی آئین کے تحفظ کے ساتھ اس زمانے میں کر رہے تھے، جب ملک شدید ترین سیاسی بحران سے دو چار تھا اور ہمارے سیاستدان اقتدار کے حرص اور لالچ میں اتنے بدمست اور بدحواس تھے، کہ ان کو یہ بات تک یاد نہیں تھی کہ:

'عوام بھی کوئی چیز ہے۔'

عوام کے معاشرتی استحکام کیلئے وہ ایک عوامی آئین کی ضرورت کو محسوس کر رہے تھے۔ اور یہ بات وہ سیاستدان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مدبر کی حیثیت میں کہہ رہے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ جب تک آئین کو عوام کے مزاج سے مطابق وضع نہیں کیا جاتا تب تک ملک کے سر پر خطرات منڈلاتے رہیں گے:

''یہ بات واضح ہے کہ کوئی آئین اس وقت تک سرکاری مشنری کو تسلی بخش انداز میں کنٹرول نہیں کر سکتا، جب تک اس میں انتظامیہ کی تشکیل عوامی مزاج کے مطابق نہ ہو۔ بلاشبہ اگر دستور عوامی قانون یعنی عوام کی مرضی اور جذبات کا مظہر نہیں ہے تو اس کے خلاف یقیناً بغاوت ہوگی۔ سب سے زیادہ خطرہ اس وقت ہوتا ہے جب آئین کو اس قدرتی اور منطقی ماحول سے اکھاڑ کر بعجلت تمام اسے کسی قطعاً مختلف سرزمین پر نافذ کر دیا جائے۔ البتہ نظریات کو مستعار لینا اور فطری علاقے کے سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ لیکن آئین کی دستاویز کے بیشتر حصہ کو مقامی کیفیات میں فٹ ہونا چاہیے اور اسے معاشرے کی شخصیت میں سمو لینا چاہیے۔''

وہ آئین کی تیاری میں نظریات و خیالات مستعار لینا کسی حد تک درست سمجھتے تھے، لیکن تب، جب وہ مقامی کیفیات سے ٹکراؤ میں نہ آتے ہوں، کیونکہ اگر غیر دانشمندانہ اور غیر محتاط طریقے سے کچھ ایسی نظریات کو آئین کا حصہ بنایا جاتا ہے، جو کہ مقامی ثقافت، اذہان، روایات اور خواہشات سے متصادم ہوتے ہیں تو ''آئین سازی میں نقالی ایک ناقابل معافی غلطی بن جاتی ہے۔'' بھٹو صاحب آئین میں نقالی کے خلاف تھے، مگر وہ آئین کو کوئی جامد یا منجمد مظہر نہیں سمجھتے تھے وہ جانتے تھے معاشرہ، اس کی ثقافت، عادات و اطوار اور حالات مسلسل تغیر پذیر ہوتے ہیں، اگر آئین جامد صورت میں رہے گا، تو بدلتے ہوئے حالات اور تقاضاؤں سے ہم پلہ نہیں ہو سکے گا، جدید ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر رہے گا۔ اس لئے اپنے اس مضمون میں وہ خبردار کرتے ہیں کہ:

www.bhutto.org

''اگر آئین بے بدل اور غیر تغیر پذیر ہو تو اس کیلئے قومی تشخص کو زیادہ دیر تک برقرار رکھنا ناممکن ہوگا۔ عوامی اقدار مسلسل بدلتی رہتی ہیں اور ایک اچھے آئین کیلئے لازم ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کا نوٹس لے، ورنہ اپنی قوت کو برقرار نہیں رکھ سکے گا اور عوامی آرزوؤں کا سچا مظہر نہیں رہے گا۔ بلاشبہ آئین کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان بدلتی ہوئی حقیقتوں کا عدالتی آئینہ ہو جو عوامی رجحانات اور طاقت سے تعلقات کی تبدیلی کا مظہر ہوں۔''

آئین کو ایک بے جان ڈھانچہ نہیں ہونا چاہیے، جس کو بدلتے حالات بہت پیچھے چھوڑ دیں۔ اس کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی ہمیشہ اپنے پرانے اور یکساں قوانین کی تقلید کرتا رہے۔ اس کیلئے لچک کا اصول قائم رہنا چاہیے، لیکن اس لچک میں اعتدال قائم رکھنا ضروری ہے۔ آئین میں روز بروز غیر ضروری، غیر عقلی اور گروہی مفادات کی بنیاد پر تبدیلیاں اور ترامیم اس کیلئے مضر ہیں۔ اس طرح آئین کا ایک بھیانک روپ ابھر کر سامنے آسکتا ہے۔ ایک ترقی پذیر معاشرہ کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ بھٹو صاحب آئین کی لچکدار صورت کے حامی تھے، لیکن اس کو الوہی درجہ دینے کے حق میں نہیں تھے:

''بنیادی قانون کو الوہی درجہ دینے کے خلاف پس پردہ عقل و عقیدہ یہ ہے کہ آئین ایسی شے ہے جسے ہماری خدمت کرنی چاہیے نہ کہ اس کی خدمت اور پرستش کی جائے۔''

بہر حال دوستو! فکر بھٹو کے مدبرانہ پہلو کو سمجھنے کیلئے ''آئینی روایات'' ایک بنیادی مضمون ہے، جس سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ آئینی مسائل اور پیچیدگیوں سے اور اس کی مختلف اشکال اور مراحل سے کس حد تک واقف تھے۔

علاوہ ازیں آپ جائزہ لے سکتے ہیں کہ بھٹو صاحب ۱۹۷۴ء میں آئین سازی کیلئے جن باتوں کو مفید اور معتبر قرار دے رہے تھے وہ آج بھی اہمیت کی حامل ہیں، مثلاً بھٹو صاحب آئین میں لچک کے حامی تھے، لیکن اس میں متواتر ترامیم اور گروہی مفادات کا تحفظ کرنے والی تبدیلیوں کے خلاف تھے۔ انہوں نے خبردار کیا تھا کہ آئین میں اس قدر تبدیلیاں نہیں ہونی چاہئیں کہ اس کا نقشہ ہی بگڑ جائے۔ اب صورتحال ہمارے سامنے ہے، مملکت پاکستان کے اکیلے باضابطہ آئین میں گروہی اور مخصوص مفادات کی بنیاد پر اتنی غیر متناسب اور غیر ضروری ترامیم کی گئی ہیں، کہ اس کی اصل صورت

www.bhutto.org

پہچاننے میں دقت ہوتی ہے۔ دن بدن آئین کا ایک خوفناک روپ ہمارے سامنے آتا جارہا ہے۔ یہ مدبر بھٹو تھے جنھوں نے خبردار کیا تھا کہ اقتدار کے نشہ میں چور ایک مخصوص غیر جمہوری گروہ اقتدار پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کیلئے آئین کو اپنے ہتھیار کے طور پر استعمال کررہا ہے اور آئین ہماری حفاظت کرنے کے بجائے ایک مفاد پرست اور عوام مخالف گروہ کا تحفظ کررہا ہے۔ اس میں آئین کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ ان ہاتھوں کا گناہ ہے، جو ملک کے عظیم ترین مفادات کے نام پر اپنے مفادات کا دفاع کر رہے ہیں۔

بہرحال خواتین وحضرات! اب ہم بھٹو صاحب کے ایک اور اہم مضمون پر بات چیت کریں گے۔ جس کا موضوع ''جمہوریت کی نشوونما'' ہے۔ یہ مضمون ہمیں بتاتا ہے کہ ابھی جب بھٹو صاحب باقاعدہ سیاست میں وارد نہیں ہوئے تھے، تب وہ جمہوریت کو کیسے دیکھتے تھے اور اس کی بابت کیسے خیالات رکھتے تھے۔

قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو ایک دانشور تھے وہ ہمہ وقت بہت سارے موضوعات پر دسترس رکھتے تھے۔ قانون، سیاسیات، سماجیات اور تاریخ ان کے مرغوب موضوع تھے، اس کے علاوہ وہ آرٹ کے موضوعات کو بھی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ ان کے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ مسلسل مطالعے میں رہنے کے عادی تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان کے سیاسی حالات انہیں ایک سیاستدان بننے پر مجبور نہ کرتے تو دنیا ان کو ایک ممتاز دانشور اور مدبر کی حیثیت سے جانتی۔

اپنے مضمون ''جمہوریت کی نشوونما'' جو کہ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں لکھا تھا، میں قائد عوام بھٹو سیاسی پارٹیوں کے کردار کو موضوع بنائے ہوئے ہیں اور شروع میں ہی مسلم لیگ کی ناکامی کی وجہ بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''مسلم لیگ نے اپنے اعلیٰ نصب العین کے حصول کے فوری بعد اپنی قوت کو عوام کی خدمت کیلئے بروئے کار لانے کے بجائے رضاکارانہ تحلیل کو مقدم سمجھا، اس نے عوام سے رابطہ کھودیا اور ان کے احساسات اور مسائل سے کوئی سروکار نہ رکھا۔''

یہ مضمون اس وقت لکھا گیا، جب مسلم لیگ اور پاکستان ایک نام تھا، دونوں ایک دوسرے کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے۔ لیکن کیا ہوا کہ مسلم لیگ ایک جسم بے روح بن کے رہ گئی۔ اس

www.bhutto.org

سلسلے میں وہ تحریر کرتے ہیں:

''مسلم لیگ نے اپنے شاندار آغاز کے باوجود عام آدمی کی خدمت کے تمام مواقع بری طرح ضائع کر دیئے۔ انکساری اور فعالیت کی جگہ زعم باطل اور انفعالیت نے لے لی جس سے آخر کار وہ جسم بے روح ہو گیا جو ایک وقت نہایت خوبصورت اور توی تھا۔''

کوئی بھی سیاسی جماعت عوامی رشتہ کے بغیر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔ وہ عوام کی ایک رضا کارانہ جماعت ہوتی ہے اور عوام کی منظوری سے برسر اقتدار آتی ہے۔ ایک جمہوری نظام میں سیاسی جماعتوں کا وجود لازمی ہوتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر نہ تو رائے عامہ کا اظہار مؤثر طور پر سامنے آتا ہے نہ ہی اس کو منظم کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ رائے عامہ کے بغیر حکومتی پالیسیاں کمزور اور غیر مؤثر ہو جاتی ہیں۔ مسلم لیگ رائے عامہ کے اظہار کا ذریعہ نہ بن سکی۔ اس کو عوام کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا، لیکن وہ اندرونی تضادات و اختلافات کا شکار ہو گئی اور ملک غیر مستحکم ہوتا چلا گیا، چنانچہ ملک غیر جمہوری قوتوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اگرچہ اس مضمون کے شائع ہونے تک ملک پر فوج نے قبضہ جما لیا تھا، پھر بھی قائد عوام شہید بھٹو مسلم لیگ کے روشن مستقبل سے مایوس نہیں تھے، انہوں نے لکھا ہے:

''سیاسی جماعتیں ترقی کرتی ہیں اور تنزل سے بھی ہمکنار ہوتی ہیں اور بعض دفعہ انہیں احیاء کے مواقع بھی میسر آتے ہیں۔ جمہوریت میں احیاء کے مواقع ہمیشہ موجود رہتے ہیں، شرط یہ ہے کہ کوئی جماعت اپنی وجود کو مضبوط کرنے کے عزم سے بالکل محروم نہ ہو جائے۔ جمہوری نظام ایسے احیاء کی ضمانت دیتا ہے۔ سیاسی جماعتیں انتخابات میں بار بار عروج، زوال اور پھر عروج کا دائرہ مکمل کرتی ہیں۔ اس لئے جب تک پاکستان میں جمہوریت ہے، مسلم لیگ کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کے امکانات کو معدوم نہیں کیا جا سکتا۔''

یہ بات درست ہے کہ مسلم لیگ، ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے اقتدار سے الگ ہونے کے بعد برسر اقتدار آئی ہے، لیکن اس نے وہ جمہوری مرحلہ طے نہیں کیا، جو ایک سیاسی جماعت کو مکمل طور پر عوامی جماعت بننے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ مسلم لیگ میں آج بھی وہی تضادات موجود ہیں جو آزادی کے وقت تھے۔ ایک مسلم لیگ نے بہت ساری مسلم لیگوں کو جنم دیا ہے۔ یہاں

www.bhutto.org

تک کہ اس بات کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ اصل مسلم لیگ کون سی ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ شہید بھٹو نے جو بات کہی تھی وہ غلط ہے، دراصل بھٹو صاحب نے جن امکانات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ پیش گوئی کی تھی، ان امکانات پر مسلم لیگ کبھی نہیں چلی ہے، اس نے بتدریج وہ ارتقائی مراحل طے نہیں کیے جو کے ایک جمہوری جماعت کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔

بھٹو صاحب نے آگے چل کر اپنی سیاسی جماعت قائم کی۔ اگر انہی امکانات پر مسلم لیگ چلی ہوتی اور اپنے آپ کو مقبول ترین عوامی جماعت ثابت کرتی تو بھٹو صاحب کو ایک نئی جماعت بنانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

سیاسی اقدار و روایات پیدا کرنے اور ان کو طاقتور بنانے میں کسی ملک میں موجود سیاسی جماعتیں اہم کردار ادا کرتی ہیں، جمہوریت کے پھلنے پھولنے کیلئے بھی سیاسی جماعتوں کا وجود لازم قرار دیا جاتا ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ یہاں پر سیاسی جماعتیں تو موجود رہی ہیں، لیکن ان میں ایک دوسرے کیلئے احترام کا جذبہ نہیں پایا گیا۔ جمہوریت کی ترقی کیلئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ سیاسی جماعتوں کے مابین احترام کا رشتہ قائم رہے۔ اختلافات تو پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ہونے بھی چاہئیں، ان سے جمہوریت کو طاقت ملتی ہے، لیکن اختلافات تعمیری اور صحتمند ہونے چاہئیں، تخریبی اور غیر صحتمند نہیں۔ اس سلسلے میں شہید بھٹو کی رائے یہ ہے:

''جمہوریت کا لائحہ عمل بالکل الٹ ہوتا ہے، آئینی اپوزیشن کے بغیر جمہوریت زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے حکمران جماعت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ دوسری جماعتوں کا احترام کرے۔''

وہ سیاسی جماعتوں کے سیاسی کردار کا تعین اس طرح سے کرتے ہیں:

''جمہوریت میں تمام سیاسی جماعتوں کیلئے اشد ضروری ہے کہ وہ عوام کی رائے اور جذبات کو ملحوظ خاطر رکھنے کی سعی کریں، جو پارٹی عوامی خواہشوں اور امنگوں کی زیادہ ترجمانی کرے، وہ کامیاب ہوتی ہے۔ ترقی اسی تقابل سے ہوتی ہے۔ جو پارٹی اقتدار سے باہر رہتی ہے۔ وہ رائے دہندگان کی تائید حاصل کرنے کیلئے برسر اقتدار جماعت کے مقابلے میں زیادہ دلکش اور دلفریب وعدے کرتی ہے، تاکہ انہیں اپنا ہمنوا بنا سکے۔ اس ضمن میں کچھ نقائص بھی ہوتے ہیں۔ اکثر مواقع پر، بالخصوص غیر ترقی یافتہ ممالک میں ووٹ حاصل کرنے کیلئے غیر ذمہ دارانہ وعدے کئے جاتے ہیں۔

www.bhutto.org

اس قسم کے غلط وعدوں کے بارے میں جب لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ یہ محض سیاسی شٹ تھے تو ان میں مایوسی اور شکست خوردگی کا احساس اجاگر ہو جاتا ہے۔ تاہم ان نقائص کے باوجود متحارب سیاسی جماعتوں میں مستقل آویزش اور تقابل سے عوام کو فائدہ پہنچتا ہے۔"

کسی بھی ملک میں سیاسی جماعتوں کے درمیاں مقابلے کی فضا قائم رہنی چاہیے۔ یہ امر جمہوریت کی ترقی کیلئے بھی ضروری ہے تو عوام کے مفادات کے بھی عین مطابق ہے۔ جب سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے ساتھ مقابلے کی کیفیت میں ہوتی ہیں تو وہ ایک دوسرے پر سبقت لینے کی جستجو کرتی ہیں، اپنی آپ کو بہتر بناتی ہیں، عوام کو اعتماد میں لینے کی کوشش کرتی ہیں اور ان کی ترجیح پر ایک ایسا بہتر پروگرام ہوتا ہے، جو کہ ملک وقوم کی ترقی وخوشحالی کا ضامن بننے کی طاقت رکھتا ہو۔ مقابلہ آرائی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیاسی جماعتیں ایک دوسرے پر نکتہ چینی کرنے پر اپنی پوری صلاحیت اور وقت ضائع کریں۔ یہ چیز بہت خطرناک ہوتی ہے جس سے کنارہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس سے سیاسی جماعتیں جمود کا شکار ہو جاتی ہیں، ان کے اندر ترقی کرنے اور اپنی غلطیاں ٹھیک کرنے کا رویہ ختم ہونے لگتا ہے، نتیجتاً سیاسی جماعتوں کی اس بے ڈھنگ جنگ میں ملک اور قوم کی مفادات کو زنگ لگنا شروع ہوتا ہے۔

شہید بھٹو ہمیں ایک کامیاب سیاسی پارٹی کے تصور سے روشناس کرتے ہیں:

"جمہوریت میں ایک سیاسی جماعت مستقل نظریاتی مقاصد کی حامل ہونی چاہیے۔ وقتاً فوقتاً مختلف چیزوں کی اہمیت کے بارے میں فرق پڑ سکتا ہے لیکن مستقل نصب العین کی عدم موجودگی میں کوئی سیاسی پارٹی کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی۔ تمام دنیوی اشیاء اضافی ہوتی ہیں۔ اس لئے مختلف مواقع پر مستقل نوعیت کے مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں۔ اگر سیاسی جماعتیں اپنی زندگی کی طوالت کی خواہاں ہوں تو انہیں مستقل مقاصد کے حصول کے بعد پائیدار نوعیت کے حامل نئے مقاصد فوری طور پر اپنانے چاہئیں۔"

ایک مقصد پورا کرنے کے بعد دوسرے مقاصد کے فوری تعین کے اصول کے حوالے سے قائد عوام بھٹو یہ دلیل پیش کرتے ہیں:

"مثال کے طور پر غیر منقسم ہندوستان میں کانگریس کا مستقل نصب العین ہندوستان کی

www.bhutto.org

آزادی اور مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان کا حصول تھا۔ ان مقاصد کی تکمیل کرنے کیلئے دونوں جماعتوں نے برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کی۔ جب ہندوستان کو آزادی مل گئی اور پاکستان بن گیا تو دونوں جماعتوں کو یہ انتخاب کرنا تھا کہ یا تو وہ ختم ہو جائیں یا نئے مقاصد کو اپنا لیں۔ ہندوستان میں کانگریس نے فوری طور پر اپنی تشکیل نو کی اور ایک مستقل پروگرام اختیار کیا، جس کا مقصد ہندوستان کو فلاحی مملکت بنانا تھا۔ پاکستان میں، جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے، مسلم لیگ نے نئے اور دلکش مقاصد کو اپنانے کے بجائے اپنی فتح پر قناعت کر کے بیٹھ رہنے کو پسند کیا۔ ان حالات میں اس کا روشن اور تابناک کارنامہ دھندلانا شروع ہو گیا اور اس نے لوگوں کو وہ نئی اور روشن راہ نہ دکھائی، جس پر لوگ گامزن ہو سکتے۔"

اوپر دیئے گئے اقتباس سے آپ اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں، کہ مختلف موضوعات کا تجزیہ کرنے اور نتائج اخذ کرنے کیلئے ایک مدبر کی حیثیت سے بھٹو صاحب کا فنِ تقابل قابلِ ستائش تھا۔ اسی مضمون میں وہ موضوع پر اپنی دسترس کا کمال دکھاتے ہیں اور اپنے وسیع مطالعہ اور معلومات کے خزانے سے قارئین کو مالا مال کرتے تھے۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے تقابلی جائزے کے بعد وہ انگلینڈ کی دو مستقل جماعتوں 'کنزرویٹو اور لیبر پارٹی' کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہیں اور آگے چل کے امریکہ میں موجود ڈیموکریٹک اور ری پبلکن جماعتوں کے مابین تعمیری رقابت کو جمہوریت کی روح قرار دیتے ہیں۔ اس مضمون میں ان کی مدبرانہ صلاحیتیں پورے روم میں نظر آتی ہیں۔ وہ ایک سیاسی مفکر کی حیثیت سے مختلف سیاسی مسائل کی باریکیوں کو قارئین پر واضح کرتے ہیں اور تجزیہ نگاری کی اعلیٰ قدروں اور اصولوں کو قلم اور کاغذ کا غلام بنائے ہوئے ہیں۔ مثلاً کسی ملک میں متعدد سیاسی جماعتوں کی موجودگی کو اس طرح دیکھتے ہیں:

"جس طرح جماعتی نظام ڈکٹیٹرشپ کی طرف لے جاتا ہے، اس طرح بہت ساری پارٹیوں کا نظام عدم استحکام اور انتشار کا موجب بن جاتا ہے۔ متعدد سیاسی پارٹیوں کا نظام مشکل اور ناپاک اتحاد کی بناء پر کام کرتا ہے۔ یہ سیاسی سمجھوتے مصلحتوں کے رہینِ منت ہوتے ہیں اور عام طور پر تباہی پر منتج ہوتے ہیں۔ ایسے نظام میں سازشیں فروغ پاتی ہیں اور تمام مقاصد آئے دن سیاسی جھگڑوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔"

www.bhutto.org

بھٹو صاحب نے یہ بات ۱۹۵۶ء میں کہی تھی، یہ کتنی سچی ہے، اس کا اطلاق اگر موجودہ حکومت پر کریں، تو شاید درست نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ موجودہ مسلم لیگ (ق) کی حکومت ایک مخلوط حکومت ہے جس میں بہت ساری جماعتیں شامل ہیں، ان سیاسی جماعتوں کا نہ تو کوئی مستقبل ہے، نہ ہی کوئی مستقل سیاسی نصب العین، یہ صرف اقتدار میں رہنے کے مفاد کے تحت ایک دوسری سے بندھی ہوئے ہیں، مسلم لیگ (ق) کی موجودہ حکومت کی حیثیت ایک سیاسی پناہ گیر کیمپ کی سی ہے، کوئی مستقل عمارت نہیں، جب یہ خیمہ اکھڑ جائے گا تو ہر کوئی نئی پناہ کی تلاش میں نکل جائے گا۔ متعدد سیاسی جماعتوں کی حکومت میں آئے دن اختلافات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور شامل جماعتوں کو راضی اور باہم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سازشیں کی جاتی ہیں اور مختلف وزارتوں اور عہدوں کی لالچ کی بنیاد پر وہ پسپائی اور ناکامی کی طرف جاتی ہیں۔ اس طرح کا مفاد پرستانہ سیاسی انضمام ملک اور عوام کی خوشحالی، ترقی اور فلاح و بہبود کے بجائے ملکی اور قومی تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔

دوسری طرف ایک سیاسی جماعت جس کے پاس اپنا ایک سیاسی پروگرام ہوتا ہے۔ وہ اتحادوں سے اقتدار پر آنے کی بجائے عوام مینڈیٹ کے بل بوتے پر برسر اقتدار آتی ہے اور اپنا پارٹی پروگرام اور عوام کے ساتھ کیے گئے وعدوں کو سامنے رکھ کر انتظام چلاتی ہے۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ ایک سیاسی جماعت کوئی گروہ نہیں ہوتی، وہ گروہوں کا مجموعہ ہوتی ہے، ان گروہوں کو مربوط و مضبوط رکھنے کیلئے پارٹی ملک بھر میں اپنی شاخیں قائم کرتی ہے۔ اس سلسلے میں آیئے شہید بھٹو کی رائے معلوم کرتے ہیں جو انہوں نے موریس ڈوورگر (Maurice Duverger) کے حوالے سے پیش کی ہے:

''سیاسی جماعت ایک گروہ نہیں بلکہ گروہوں کا مجموعہ ہوتی ہے، یہ ملک بھر میں بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے گروہوں پر مشتمل ہوتی ہے جو باہمی رابطہ کے اداروں کے ذریعہ ملحق ہوتے ہیں۔ ان منتشر گروہوں کو باہم مربوط رکھنے کیلئے پارٹی کو ملک بھر میں اپنی شاخیں قائم کرنا چاہئیں۔''

اس باہمی مربوط کیفیت میں کسی جماعت کی صفوں میں ترتیب برقرار رہتی ہے اور حقیقی سیاسی قیادت ابھر کر سامنے آتی ہے:

''رابطے کی یہ باہمی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ ان میں

www.bhutto.org

ترتیب وتصفیہ کی ہم آہنگی موجود رہے، یہ جماعت کے ڈھانچے کا اہم جز ہوتی ہیں، کیونکہ ان سے صحیح قیادت ابھرتی ہے۔"

یہاں سے ہماری بات چیت آخرین مرحلے میں داخل ہوتی ہے، ابتک آپ کے ذہن میں بات آچکی ہوگی کہ شہید بھٹو اپنی ذات میں صرف ایک سیاستدان نہیں تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سیاسی میدان میں قدم رکھنے سے پہلے ہی ایک مدبر کی حیثیت سے انہوں نے ملک کو درپیش مسائل پر اپنی رائے سے آگاہ کیا تھا، آخر میں مذکورہ بالا مضمون میں انہوں نے جمہوریت اور سیاسی پارٹی کے کردار سے بحث کی ہے۔ یہاں سے آپ یہ بات معلوم کرسکتے ہیں کہ وہ پہلے سے ہی جانتے تھے کہ ایک سیاسی پارٹی کیا ہوتی ہے اور وہ کیسے وجود میں آتی ہے۔ اس کا اصل نصب العین کیا ہوتا ہے، اس کی کامیابی کا راز کس بات میں پنہاں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ انہوں آگے چل کر پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے جماعت بنائی، جو ملک کے عوام کیلئے ایک نئی خوشخبری سے کم نہیں تھی۔ اسی جماعت نے عوام کو ان کی طاقت کا احساس دلایا، انہیں طاقت کا اور ریاست کا حقیقی سرچشمہ قرار دیا۔ اسی جماعت کی مثال کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک عوامی پارٹی کیا ہوتی ہے۔ زیر بحث آخری مضمون سے پہلے مضمون "آئین کے لوازمات" پر بات چیت ہو چکی ہے، یہاں سے آپ خود اندازہ کریں کہ ۱۹۷۳ء کا آئین شہید بھٹو اس لئے بنا پائے، کہ وہ خود ایک آئینی اور قانونی ماہر تھے، ان کو معلوم تھا کہ آئین کیا ہوتا ہے اور اسے کیسا ہونا چاہیے؟

اپنی بات چیت یہاں پر ختم ہوتی ہے، مجھے امید ہے کہ آپ ذوالفقار علی بھٹو کے اس مدبرانہ پہلو سے ضرور واقف ہوئے ہوں گے۔ قائد عوام کی یہ تحریریں ایک بہت بڑے خزانے سے معمور ہیں، جن سے ہم اپنے آپ کو، اپنی جماعت کو، عوام کو اور مملکت پاکستان کو مالا مال کرسکتے ہیں، یہ تحریریں ان کی مدبرانہ اور ادیبانہ حیثیت کا تعین کرتی ہیں اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر سیاسی میدان میں وہ نہ بھی اترتے، تو دنیا کے کچھ مایہ ناز مدبروں، مفکروں اور دانشوروں میں ضرور گنے جاتے۔

www.bhutto.org

بھٹو اور بین الاقوامی تعلقات

ہم فکر قائد عوام کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے آئے ہیں، آج ہم شہید بھٹو کی خارجہ پالیسیوں پر گفتگو کریں گے، ان کی یہ پالیسیاں ہمیں ان کے فکر کو سمجھنے میں کافی مددگار ثابت ہوں گی۔ موضوع پر باقاعدہ گفتگو کرنے سے پہلے آپ کو ایک واقعہ ضرور سنانا چاہوں گا، جب شہید بھٹو نے وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالا، تو اس کے بعد جب پہلے مرتبہ وہ امریکہ گئے، تو ان کی ملاقات اس وقت کے امریکی صدر کینیڈی سے ایوان صدر، وائٹ ہاؤس میں ہوئی۔ دونوں رہنما ایک دوسرے کے ہمعمر قریب تھے اور ان میں ایک دوستانہ تعلق تھا۔ ملاقات ختم کر کے جب دونوں باہر آئے تو بھٹو صاحب کا بازو پکڑ کر صدر کینیڈی نے کہا کہ "اگر تم امریکی ہوتے تو میری کابینہ میں ضرور وزیر ہوتے۔"

بھٹو صاحب نے جواب دیا کہ "اگر میں امریکی ہوتا تو آپ کی جگہ پر صدر ہوتا۔"

اس جواب پر دونوں ہنس پڑے۔ اس ملاقات کے ایک مہینہ بعد جان۔ ایف۔ کینیڈی قتل کر دیے گئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی یادداشت کی کتاب میں اس واقعے کا ذکر کچھ اس طرح سے کیا ہے:

"مجھے ابو نے نیند سے جگا کر کہا کہ یہ وقت سونے کا نہیں۔ بہت بڑا حادثہ ہو چکا ہے، آمریکی نوعمر صدر قتل کر دیے گئے ہیں۔"

آپ کی معلومات کیلئے یہ گزارش کرتا چلوں کہ موضوع پر بات کرنے کیلئے ہمارے ماخذات بھٹو صاحب کے مختلف مقالے اور مضامین ہوں گے، اور آخر میں ان کے تقاریر کے خاص اقتباس بھی شامل ہوں گے۔

www.bhutto.org

ہمارا موضوع خارجہ پالیسی ہے۔ اس لئے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ خارجہ پالیسی کیا ہے؟ زمانہ جدید میں کوئی بھی ریاست بین الاقوامی معاملات سے الگ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ لہٰذا وہ عالمی امور میں شریک ہونے کیلئے کہیں نہ کہیں مجبور ضرور ہوتی ہے۔ لیکن بین الاقوامی معاملات میں شریک ہونے سے پہلے ریاست کچھ اصول طے کرتی ہے۔ انہیں اصولوں کو خارجہ پالیسی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ اصول کسی ریاست کے مقاصد و مفادات کا تعین کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں پر ہم بین الاقوامی امور اور خارجہ پالیسی کو سمجھنے کیلئے کچھ مدبروں اور دانشوروں کے خیالات کی مدد بھی لیں گے۔ کس مدبر نے یہ کہا ہے کہ خارجہ پالیسی کے بغیر ایک ریاست کی حیثیت ایسی ناؤ جیسی ہوتی ہے، جس کی کوئی سمت نہیں ہوتی، بس بے مقصد تیرتی جاتی ہے اور اسے آنے والے طوفانوں کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں مشہور مدبر پیڈل فورڈ اور لنکون (Lincoln) کا کہنا ہے کہ:

''کسی ریاست کی خارجہ پالیسی بیرونی ماحول کے ساتھ مطابقت و مصلحت اور اعمال کے رسمی اندراج اور جاری کردہ بیانات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ کوئی خارجہ پالیسی سادہ اور آسان نوعیت کی ہو سکتی ہے تو پیچیدہ اور گہری بھی ہو سکتی ہے۔ خارجہ پالیسی بطور مجموعی ایسے مرحلے کا نام ہے، جس کے ذریعے ایک ریاست وسیع پیمانے پر اپنے مقاصد و مفادات کا تعین کرتی ہے اور اعمال کا ایسا طریق کار اختیار کرتی ہے کہ جس سے اس کے ہدف اور مفادات حاصل کیے جا سکیں۔''

پروفیسر ایف۔ ایس۔ نارتھیج (F. S. Northedge) کا کہنا ہے کہ:

''خارجہ پالیسی کا تعلق ایسے سیاسی اثر کے استعمال سے ہے، جس کے ذریعے دوسری ریاستوں کو اپنی قانون سازی کی طاقت کو اس طرح سے بروئے کار لانے کیلئے مجبور کیا جائے، جو کہ متعلقہ ریاست کی خواہشات کے عین مطابق ہو۔''

جب کہ ایک صاحب جن کا نام گھسن ہے، ان کا کہنا ہے کہ:

''خارجہ پالیسی کی بنیاد ایک علم اور تجربہ کے بنیاد پر وضع کیے گئے بلیغ و فصیح منصوبے پر

www.bhutto.org

ہوتی ہے، جس کے ذریعے حکومت کے کاروبار کا تعلق پوری دنیا سے جوڑا جاتا ہے۔ اس کا مطلب قوموں کے مفادات کو بڑھاوا دینا اور ان کا دفاع کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایک واضح سمجھ بوجھ کا تقاضا کرتا ہے کہ مفادات کیا ہیں اور کتنے عرصے اور حد تک ان کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس سے کم جو بھی چیز ہے اسے خارجہ پالیسی نہیں کہا جا سکتا۔"

علاوہ ازیں روڈی، اینڈرسن اور کرسٹل نامی دانشوروں کی رائے بطور مجموعی یوں ہے کہ خارجہ پالیسی مختلف گروہوں کو اصولوں کے وضع کرنے اور ان کا نفاذ کرنے پر آمادہ کرتی ہے جو کہ کسی ریاست کے کیفیتی طریق کار کا خاکہ تیار کرتے ہیں، اسی بنیاد پر دوسری ریاستوں سے تعلقات اس طرح استوار کئے جاتے ہیں کہ اپنے مفادات کو وسیع کیا جا سکے اور ان کا دفاع ممکن بنایا جا سکے۔

دانشوروں اور مدبروں کے ایک دوسرے سے رائے اختلاف اپنی جگہ پر تاہم اوپر دی گئی وضاحتوں سے یہ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ خارجہ پالیسی بیرونی دنیا سے تعلقات کا نام ہے، جن کے ذریعے کوئی ریاست اپنے مفادات کا تحفظ کرتی ہے اور بیرونی مدد سے اپنی اندرونی ترقی کے مقاصد حاصل کرنے کیلئے جستجو کرتی ہے۔ میرے خیال میں آپ کو بہت زیادہ نہیں، تو کچھ حد تک، یہ احساس ہو گیا ہوگا، کہ خارجہ پالیسی کیا ہوتی ہے۔

اس کے بعد موضوع کے سلسلے میں بھی جاننا ضروری ہے کہ ایک ریاست کے دوسرے ریاست یا ریاستوں سے تعلقات میں کون کون سے محرکات اور عناصر کام کر رہے ہوتے ہیں، ان کا مختصر جائزہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ریاستوں کے تعلقات میں نظریہ اور عقیدہ بہت اہم چیز ہوتی ہے، جو کہ ریاستوں کے مابین رشتوں میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ایسے تعلقات کو فطری یا روحانی تعلقات قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں اکتوبر کے کمیونسٹ انقلاب کے بعد مختلف اکائیوں کے انضمام والحاق سے متحدہ روس وجود پذیر ہوا، جس کی اساس نظریہ تھا۔ اس ضمن میں آپ پاکستان کی مثال لیں، تو جان سکتے ہیں کہ ان کے تعلقات مشرق وسطیٰ اور باقی دنیا کی اسلامی ریاستوں سے ہمیشہ سے قائم ودائم رہے ہیں۔ یہ

www.bhutto.org

تعلقات بھی فطری نوعیت کے ہیں، جن کی بنیاد مذہبی عقیدہ پر ہے۔ یہ تعلقات و روابط عموماً مستقل نوعیت کے ثابت ہوتے ہیں۔

نظریاتی تعلقات کے بعد معاشی عنصر یا پہلو کی باری آتی ہے، عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ معاشی استحکام کی بنیاد سیاسی طاقت پر ہوتی ہے۔ کسی بھی ملک کی اقتصادیات خارجہ پالیسی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

افلاطون کا خیال تھا کہ معاش جنگ کا باعث ہے، اپنی کتاب ''ری پبلک'' میں وہ کہتے ہیں کہ ایک ریاست کو غریب ہونا چاہیے، کیونکہ اس صورت میں وہ کسی پر حملہ کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔ یہ ایک تخیلاتی اور اختراعی وضاحت ہے۔ معاشی نظریے کیلئے ہم کارل مارکس سے رجوع کریں، تو بہتر نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ اقتصادیات ایسی قوت محرکہ ہے، جو سیاسی رویہ کا تعین کرتی ہے۔ حالیہ برسوں میں تو خارجہ پالیسی کی تشکیل میں ایک عنصر کی حیثیت سے اقتصادیات کو اہم جز و قرار دیا جارہا ہے۔ خارجہ پالیسی کا یہ عنصر بہت اہم اس لئے بھی ہے کہ یہ تعلقات کو بڑھانے اور سنوارنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس پہلو پر قائد عوام نے بہت کھل کر لکھا ہے، جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

اقتصادی تعلقات کے بعد ہم سیاسی تعلقات کی طرف چلتے ہیں، جو کہ بذات خود ایک بہت بڑا موضوع بھی ہے اور اس کی ساتھ ساتھ خارجہ پالیسی کا اہم ستون بھی ہے۔ جس قسم کا کسی ملک کے اندر نظام قائم ہے، اس قسم کے سیاسی تعلقات کو بیرونی ممالک میں فروغ دینے کیلئے کوششیں کرتا ہے۔ اس وقت دنیا میں دو اقسام کے سیاسی نظام حکومت موجود ہیں، ایک جمہوری طرز حکومت، جس میں حکومت عوام کی خواہشات اور امنگوں کے پیش نظر اپنی اندرونی خواہ بیرونی پالیسیاں وضع کرتی ہے۔ اس نظام میں حکومت پر فرض ہوتا ہے کہ وہ عوام کے حقوق اور مفادات کا تحفظ کرے۔ دوسرا مطلق العنان یا آمرانہ طرز حکومت ہے۔ جس میں ایک فرد ریاست کا حاکم ہوتا ہے اور اپنی مرضی سے حکومت کرنے یا چلانے کو ترجیح دیتا ہے۔ جب ریاستیں ایک دوسرے سے تعلقات استوار کرتی ہیں تو

www.bhutto.org

اس بات کو ضرور مدنظر رکھا جاتا ہے کہ ان کا قریب تر سیاسی حلیف کون ہے۔ یہ سیاسی تعلقات ہیں جو جنگی ماحول اور سیاسی تضادات و اختلاف کو اپنے حق میں کرنے کیلئے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سیاسی تعلقات کے ضمن میں آپ پاک۔چین تعلقات کی مثال لے سکتے ہیں۔ یہ چین کے ساتھ پاکستان کے بہتر سیاسی تعلقات کا ہی نتیجہ تھا، کہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی لڑائیوں میں چین نے پاکستان کو ہر قسم کی مدد اور حمایت دی۔ جبکہ مطلق العنان یا شخصی حکومتوں میں تعلقات کیلئے آپ دوسری جنگ عظیم کی مثال لے سکتے ہیں جس میں ہٹلر اور اٹلی کا فاشسٹ حکمران مسولینی ساتھ ساتھ تھے۔ سیاسی تعلقات میں معاشی پہلو کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ اگر ایک ترقی پذیر ملک کسی ترقی یافتہ ملک سے گہرے اور مستقل قسم کے روابط قائم کرتا ہے، تو اس کا نتیجہ ترقی پذیر ملک کے استحصال کی صورت میں بھی سامنے آ سکتا ہے۔ اس لئے سیاسی تعلقات ایک خاص احتیاط کا تقاضا کرتے ہیں۔

یوں تو خارجہ پالیسی کے یہ سارے محرکات و عناصر اہم ہیں، لیکن دفاعی تعلقات کا حوالہ تمام ضروری ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دفاعی طاقت فیصلہ کن ہوتی ہے۔ دوسرے ملکوں کو اپنی جانب کھینچنے اور انہیں اپنے مفادات میں استعمال کرنے کیلئے دفاعی طاقت کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دفاعی طاقت کسی ریاست کو محفوظ رکھنے میں سودمند ثابت ہوتی ہے۔ جیسا کہ خود حفاظتی تدابیر ہر ایک ریاست کی اولین ترجیح ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ مختلف ریاستوں کے ساتھ دفاعی تعلقات برقرار رکھیں۔ دفاعی تعلقات میں بڑی طاقتوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ جس کے ساتھ فوجی رابطہ اور رشتہ قائم رکھنے کیلئے چھوٹی ریاستیں کوشاں رہتی ہیں۔ عموماً یہ صورت حال بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ بڑی طاقتیں ایک دوسرے سے محاذ آرائی پر اتر آتی ہیں۔ ایسی کیفیت میں چھوٹی دفاعی قوتوں کے اوپر ایک امتحان کی سی گھڑی آ جاتی ہے کہ وہ کس کی طرفداری کریں۔ اس معاملہ کو متحدہ روس اور امریکہ کی محاذ آرائی کے پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اب ہم آتے ہیں خارجہ پالیسی کے مقاصد کی طرف۔ کسی ملک کے خارجہ پالیسی کے اہم مقاصد یہ ہوتے ہیں:

www.bhutto.org

۱- شہریوں کے مفادات کا تحفظ اور ملکی سلامتی:

اندرونی خواہ بیرونی سطح پر شہریوں کے مفادات کا تحفظ اور ملکی سلامتی اور استحکام کا دفاع کرنا۔ اس ضمن میں عموماً ممالک مستقل نوعیت کی پالیسی اختیار کرتے ہیں کیونکہ پالیسیوں میں ردوبدل سے ان کی پوزیشن مشکوک اور کمزور ہونے لگتی ہے۔

۲- عالمی برادری کے ممبران سے رابطہ:

عالمی برادری کے ممبران سے رابطہ برقرار رکھنا اور ان کے ساتھ تضاد اور تعاون کا رویہ قائم رکھنا، یوں کہ ملکی مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ بھارت نے اسرائیل کے ساتھ سرعام اپنے تعلقات کا اعلان کبھی نہیں کیا، حالانکہ اندرونی سطح پر وہ نزدیکی اتحادی ہیں۔ بھارت کے اس متناقض رویے کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ جانتا ہے، کہ اگر اسرائیل سے کھل کر تعلقات استوار کرے گا تو عرب ممالک کے ساتھ اس کا کاروباری رشتہ منقطع ہو سکتا ہے۔

۳- خود حفاظتی نظریے پر عمل کرنا:

ہر ایک ریاست کیلئے یہ ضروری ہوتا کہ وہ اس طرح کی خارجہ پالیسی ترتیب دے کہ اس کی سرحدیں محفوظ رہیں اور اندرونی استحکام پر کوئی منفی اثر نہ پڑے۔

دیکھا گیا ہے کہ مختلف مواقع پر ریاستوں کے درمیان ٹکراؤ کی کیفیت ابھر آتی ہے۔ اس صورت میں ہر ایک ریاست مختلف معاہدوں اور باہمی رشتوں کو پس پشت رکھ کر اپنی حفاظت کو ترجیح دیتی ہے۔

۴- اقتصادی فوائد کا حصول:

معاشی پالیسی ہر ایک ملک کی خارجہ پالیسی کا اہم جزو ہوتی ہے۔ ہر ایک ملک کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ معاشی میدان میں طاقتور ہو، کیونکہ یہ طاقت عالمی برادری میں اس کی حیثیت کا تعین کرتی ہے۔ اپنے معاشی تعلقات کو بڑھاوا دینے کیلئے بہت سارے ممالک کبھی کبھار جو کھم بھی اٹھاتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ قائد عوام کے روس کے ساتھ کئے گئے تیل کے معاہدہ کا مثال

www.bhutto.org

لے سکتے ہیں، حالانکہ پاکستان امریکی معاہدوں سیٹو اور سینٹو کا ممبر بھی تھا۔

۵- اثر ورسوخ کو وسیع کرنا:

ایک ریاست اپنی اثر ورسوخ کو دوسرے ممالک تک وسیع کرنے کی کوششیں بھی کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ دوسرے ممالک اس کے زیر دست رہیں۔ اس معاملے میں دوسری جنگ عظیم کے بعد متحدہ روس اور امریکہ کے درمیان جاری رہنے والی سرد جنگ کا حوالہ لے سکتے ہیں، جب دنیا دو واضح گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔

اس کے بعد ہم چلتے ہیں پاکستان کی خارجہ پالیسی کی طرف۔ پاکستان ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا، یہ دور اس نوزائیدہ ریاست کیلئے بہت سے معنوں میں عالمی سطح پر خوشگوار بھی تھا، تو ناسازگار بھی۔ خوشگوار اس معنی میں کہ دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اب دنیا امن کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اس مقصد کے حصول کیلئے نئے نئے ادارے تشکیل دیئے جا رہے تھے، نئے نئے معاہدے ہو رہے تھے اور دنیا میں مل کر کام کرنے کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ پاکستان کو اندرونی سطح پر بہت سارے مسائل درپیش تھے، لیکن عالمی سطح پر چلنے والی امن کی تحریک سے اسے بہت سارے فوائد حاصل ہوئے، اور حالات کا ناسازگار پہلو یہ تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد روس اور امریکہ کے مابین سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا، دونوں ممالک اپنے لئے نئے نئے اتحادیوں کی تلاش میں تھے، یہ دو سپر پاورز ایک دوسرے پر فوجی، سیاسی اور اقتصادی سبقت لے جانے کیلئے میدان عمل میں نبرد آزما تھے۔ اس طرح دنیا دو عظیم جنگوں کے بعد بھی ایک ہو جانے کا خواب دیکھتے ہوئے بھی دو واضح بلاکوں میں منقسم ہو کے رہ گئی تھی۔

ایسی حساس صورتحال میں پاکستان کیلئے دونوں سپر پاورز میں سے کسی ایک کو چننا تھا، متحدہ روس یا امریکہ۔ اس انتخاب میں پاکستان نے امریکہ کی جانب جھکاؤ پیدا کیا۔ حالانکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ روس نے پاکستان کی جانب دوستی کا ہاتھ پہلے بڑھایا تھا، لیکن اس وقت کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے سوویت یونین پر امریکہ کو ترجیح دی اور روس جانے کے بجائے وہ امریکہ جا پہنچے۔

www.bhutto.org

اس طرح پاکستان مغربی بلاک میں شامل ہوگیا۔ اور اس نے مشہور معاہدوں سیٹو اور بغداد پیکٹ (سینٹو) میں رکن کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے اس اقدام پر بہت اختلاف رائے موجود رہا ہے، پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ قیام کے بعد ملک کو فوری طور پر معاشی اور فوجی امداد کی شدید ضرورت تھی اور اس کو اپنی سرحدوں کو بھی محفوظ رکھنا تھا، کیونکہ اپنے ہمسایہ حریف ملک کے مقابلے میں اس کی قوت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اگرچہ ان کمیونسٹ مخالف اور امریکی مفادات کے ترجمان معاہدوں میں شریک ہونے سے قلیل مدت کیلئے تو پاکستان کو فائدہ ہوا، لیکن طویل مدت میں اس کے بہت منفی نتائج سامنے آئے جو پاکستان کو بھگتنا پڑے اور اس پر یہ بات واضح ہوئی کہ جن امکانات کے پیش نظر وہ مغربی بلاک کے معاہدوں میں شریک ہوا تھا، وہ اس کا دفاع کرنے میں ناکام ہوئے۔

اپنے قیام کے بعد پاکستان مغربی بلاک کا حصہ رہا، لیکن اندرونی مسائل کے سبب وہ اپنی خارجہ پالیسی کی جانب کوئی خاص توجہ نہ دے سکا۔ اس کی پالیسی امریکہ دوستی اور اقوام متحدہ میں بھارت کے ساتھ کشمیر مسئلہ اور سرحدی معاملات تک ہی محدود تھی۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی میں نیا موڑ اس وقت آیا، جب قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو ۱۹۵۸ء میں ملک کے وزیر تجارت بنے، ان کی عمر اس وقت ۳۰ برس تھی۔ اس طرح انہوں نے کابینہ میں سب سے کم عمر وزیر ہونے کا اعزاز پایا۔

شہید بھٹو نے وزیر تجارت کا قلمدان سنبھالنے کے بعد پاکستان کی خارجہ پالیسی کو نئی سمتیں بخشیں۔ انہوں نے ملک کے بیرونی تصور کو بدل دیا۔ پاکستان مغربی معاہدوں کی وجہ سے اپنے تعلقات میں یکسانیت کا شکار تھا اور اس کی حیثیت ایک کمزور جانبدار اتحادی اور وفادار کی سی تھی۔ شہید بھٹو نے وزیر تجارت بننے کے بعد روس اور چین سے روابط بڑھائے۔ حالانکہ پاکستان سیٹو اور سینٹو جیسے مغربی معاہدوں کا رکن تھا، لیکن یہ بھٹو صاحب کی جرأت تھی کہ انہوں نے روس اور چین کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کئے۔ اس سے پہلے کسی بھی حکومتی منصبدار کو ایسا قدم لینے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔

www.bhutto.org

حکومت کا حصہ بننے کے بعد انہوں نے پاکستان کو کثیر الملکی معاہدوں سے نکالنے کی کوشش کی اور دو طرفہ تعلقات کے فروغ کو ترجیح پر رکھا۔

انہوں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو غیر جانبدار بنایا، وہ سمجھتے تھے کہ چھوٹی قوموں کیلئے ضروری ہے، کہ وہ غیر جانبدار رہیں اور اپنے مفادات کی راہ میں وہ کسی بھی بڑی طاقت سے ٹکراؤ میں نہ آئیں۔

شہید بھٹو حکومت میں آنے سے پہلے ہی بین الاقوامی حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تھے۔ میں یہاں پر "ویژن" میگزین میں (۱۹۵۴ء) ان کے شائع شدہ مضمون "خود حفاظتی کے معاہدے اور علاقائی انتظامات" کا حوالہ دینا چاہتا ہوں، جس کی شروعات وہ اس طرح کرتے ہیں:

"۴-اپریل ۱۹۴۹ء کو واشنگٹن میں نیٹو (معاہدہ شمالی اوقیانوس) کی تنظیم وجود میں آئی تو سوویت یونین نے اپنے حواری ممالک اور کمیونسٹ پروپیگنڈے کی عظیم مشنری کے ذریعے اس پر دو طرفہ حملہ کر دیا اور اس تنظیم کے خلاف پورے زور و شور سے زہر اگلا جانے لگا۔ لیکن ۹-ستمبر ۱۹۵۴ء کو منیلا میں امریکہ کی زیر نگرانی جنوب مشرقی ایشیا (کہ اس وقت اس کی کوئی شکل واضح نہ تھی) کے دفاع کیلئے نیٹو کا ثانی سیٹو (معاہدہ جنوب مشرقی ایشیا) تیار کیا گیا۔"

اس موقعہ پر بھٹو صاحب نے مغربی بلاک میں شامل ہونے کی پالیسی پر اپنی رائے دی کہ:

"پاکستان کو ایک دستخط کنندہ کے طور پر اس دشمنی اور نفرت سے آگاہ ہونا چاہیے، جو اسے اپنی لپیٹ میں لینا چاہتی ہے اور اسے ایک بانی رکن کے طور پر اپنی حیثیت کا جائزہ لینا چاہیے، اپنی قسمت کسی ایک بلاک سے وابستہ کرنے کا انحصار دو بنیادی مفروضات پر ہوتا ہے:

۱- بڑی طاقتوں کی کشمکش کے اس دور میں غیر جانبداری ناقابل عمل ہے۔

۲- مستقبل قریب میں کسی ایسی مساوی و ہم پایہ تیسری طاقت کے ظہور کا کوئی امکان نہیں، جو توازن اقتدار قائم کر سکے۔"

www.bhutto.org

قائد عوام حالات سے واقف تھے اور ان سے ملنے والے نتائج سے بھی واقف تھے۔ وہ بڑی طاقتوں کی چکی کے دو پاٹوں میں پاکستان کو پستے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ امریکی خارجہ پالیسی کا لب لباب کیا ہے اور یہ کہ زیادہ سے زیادہ ملکوں کو اپنے قریب لانے اور انہیں مختلف معاہدوں میں مقید کرنا کیوں چاہتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ امریکہ چاہتا ہے کہ اقوام عالم کو ایسے رشتوں میں باندھ دیا جائے کہ اگر روس یا کسی اور کمیونسٹ ملک سے جنگ لڑنی پڑے تو وہ اس جنگ میں امریکہ کی طرفداری کریں یا ایک طرف کنارہ لے کر کھڑے ہوں، اس ضمن میں شہید بھٹو لکھتے ہیں:

''پاکستان کے حالیہ مواعید سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی کے خالقوں نے غیر جانبدار رہنے کی اہمیت اور تیسری طاقت کے ظہور کے امکانات کو رد کر دیا ہے۔ اس ضمن میں امریکہ کی خارجہ پالیسی پاکستان کی پالیسی سے غیر مشابہ نہیں ہے۔ امریکہ کے نام نہاد دو طرفہ تعلقات کی پالیسی کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ آہنی پردے سے باہر کی تمام اقوام کو باہمی معاہدوں کے ایسے جال میں پھنسایا جائے کہ اگر کمیونسٹ ملک سے جنگ کی صورت پیدا ہو جائے تو پھر یہ تمام ممالک اس میں الجھ جائیں۔''

اس دور میں امریکہ خواہ روس کیلئے اس طرح کے خیال رکھنا اور اس کا کھلی طرح اظہار کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ شہید بھٹو کی آنکھ ہی تھی، جو اس دور کی ساری عالمی کارگزاری کو غیر جانبدار نظر سے دیکھ رہے تھے۔ وہ روس اور امریکہ کے درمیاں چلنے والے سرد جنگ کا حصہ نہیں بننا چاہتے تھے نہ ہی بڑی طاقتوں سے دوری کو درست سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جہاں جہاں قومی مفادات کیلئے موزون ہو وہاں پر دونوں ملکوں سے مختلف شعبوں میں تعلقات قائم کئے جائیں۔ یہ تعلقات اس طرح کے ہوں کہ ایک ملک کے قریب آنے سے دوسرا ملک دور چلا نہ جائے۔ وہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں ایک خاص قسم کے توازن کی بات کر رہے تھے۔ اور جن جگہوں پر پاکستان کو انہوں نے نقصان میں جاتے ہوئے دیکھا، ان مقامات کی نشاندہی بھی کی۔ وہ سیٹو اور سینٹو

www.bhutto.org

جیسے کثیر الملکی معاہدوں میں پاکستان کی شمولیت کو سودمند نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس بات کا اظہار زیر بحث مضمون میں کیا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ معاہدے رکن ممالک کا تحفظ کرنے کے بجائے امریکی اور یورپی ممالک کے مفادات کو پورا کرنے کیلئے عمل میں لائے گئے ہیں۔ جب شہید بھٹو نے یہ مضمون لکھا، اس وقت تک ان معاہدوں کے روحانی اسرار سب پر کھل چکے تھے کہ جب کبھی بھی غیر کمیونسٹ ملک کو کوئی خطرہ لاحق ہوا تو، امریکہ اور برطانیہ نے اپنا دامن صفائی سے بچا لیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ:

''معاہدہ نیٹو کی قدر و قیمت کا اندازہ گوا کے مسئلے میں پیدا ہوا تھا، ڈاکٹر سلازار نے دفعہ ۴ پر عملدرآمد پر زور دیا، لیکن تنازعہ چونکہ غیر کمیونسٹ ممالک کے درمیان تھا، اس لئے ریاست ہائے متحدہ، برطانیہ عظمیٰ اور کینیڈا نے نہایت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے صرف بھارت کو ایک احتجاجی مراسلہ بھجوانے پہ اکتفا کیا۔''

شہید بھٹو ان معاہدوں کی بہت ساری دفعات کو زیر بحث لائے ہیں، ان کا خیال تھا کہ کثیر الملکی معاہدوں سے پاکستان کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ لہٰذا دوطرفہ تعلقات کو ترجیح دینی چاہیے، یہ عمل ملک کیلئے بہتر ہوگا، اس طریقے سے نہ صرف ملک کیلئے معاشی فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں بلکہ دفاعی میدان میں بھی کافی مدد مل سکتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کثیر الملکی معاہدے کسی ممبر ملک کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ خود حفاظتی انتظام کے معاملے پر بھی انہوں زیر بحث مضمون میں بہت کچھ کہا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اقوام متحدہ کے منشور کے حوالے سے کہا ہے کہ:

''موجودہ منشور میں کوئی چیز بھی اقوام متحدہ کے کسی رکن ملک پر مسلح حملہ کی صورت میں اپنی حفاظت کے انفرادی یا اجتماعی حق کو اس وقت تک محدود یا کمزور نہیں کرے گی، جب تک سلامتی کونسل بین الاقوامی امن اور تحفظ کی برقراری کیلئے کوئی قدم نہیں اٹھا لیتی۔ اقوام متحدہ کے ارکان اپنے حق کو استعمال کرنے کیلئے جو بھی اقدام کریں۔ وہ ان سے سلامتی کونسل کو فوراً آگاہ کریں گے اور ان کے اقدام موجودہ منشور کے تحت کسی بھی طور پر سلامتی کونسل کے اختیارات اور فرائض پر اثر انداز

www.bhutto.org

نہیں ہوں گے۔ وہ جب چاہے عالمی امن وسلامتی کو برقرار رکھنے یا ان کی بحالی کیلئے ضروری کارروائی کر سکتی ہے۔"

شہید بھٹو اس اجازت کو محدود سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر ذاتی تحفظ کیلئے سلامتی کونسل کی مداخلت والے نقطہ کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کو گمان ہے کہ سلامتی کونسل کے ممبران کسی بھی معاملے کو اپنے ذاتی مفادات کیلئے استعمال کر سکتے ہیں اور کسی بھی معاملے کو ویٹو کر سکتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں:

"لیکن دفعہ ۵۱ کا سب سے زیادہ نمایاں اور دوررس اثر یہ ہے کہ ویٹو کا غلط استعمال ہو سکتا ہے۔ اس دفعہ کے تحت کسی بھی ملک کو اس وقت تک اپنے دفاع کیلئے مسلح جنگ کی اجازت ہے، جب تک کہ سلامتی کونسل عالمی امن وسلامتی کے لئے ضروری اقدامات نہیں کرتی۔"

"چونکہ کسی بھی ملک کو کسی پیشگی احتیاط کے بغیر اپنے دفاع کیلئے ہتھیار رکھنے کی اجازت ہے، اس لئے سلامتی کونسل میں کوئی بھی طاقت اپنے مخصوص مفاد کے تحت حملہ کا ہدف بننے والے ملک کی مدد کیلئے ضروری اقدام کے فیصلہ کو ویٹو کر کے سلامتی کونسل کو مفلوج کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے ویٹو کے اس غلط استعمال کا یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ بیسویں صدی کا نیرو با آسانی روم جلا سکتا ہے، جب کہ سلامتی کونسل نیویارک میں بحث مباحثہ میں الجھی رہے گی۔"

وہ سلامتی کونسل کی بناوٹ کو درست نہیں سمجھتے تھے، بالخصوص ذاتی تحفظ کے معاملے پر اس کی بالادستی کو قبول نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ خود حفاظتی اقدامات کے معاملہ میں رکن ممالک کو آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی سلامتی کیلئے جو چاہیں وہ کریں۔

قائد عوام شہید ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کی دوطرفہ خارجہ پالیسی کے خالق تھے۔ یہ ان کے ویژن کی دین ہے، جو آج تک پاکستان کو کام آ رہی ہے۔ انہوں نے غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی کی پوری تحریک کو تخلیق کیا اور بڑی قوتوں سے چھوٹی قوتوں کو الگ کر کے انہیں ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوششیں کیں خاص طور پر ایشیا اور افریقہ کے عوام کو قریب لانے کیلئے انہوں نے تاریخ ساز

www.bhutto.org

کردار ادا کیا۔ جس کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ یہاں پر ہم ان کامیابیوں کا ذکر کریں گے جب وہ وزیر تجارت، معدنیات اور قدرتی وسائل تھے، اپنی اس حیثیت سے انہوں بہت سارے ممالک کے دورے کیے، جس میں ایران، ترکی، فرانس، برطانیہ، کینیڈا، امریکہ، جاپان اور فلسطین وغیرہ شامل ہیں، ان دوروں کا مقصد تجارت کو فروغ دینا تھا، اس مقصد کیلئے انہوں نے مختلف ممالک کے سربراہان اور اپنے ہم منصبوں سے ملاقات کی۔ اپنے نومبر ۱۹۵۹ء کے دورہ کی تفصیل انہوں نے "مشروط امداد" نامی مضمون میں دی ہے جس میں لکھتے ہیں:

"میں نے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں اس امر پر بھی بحث کی کہ ہم نے بیرونی سرمایہ کاری کو زبردست اہمیت دی ہے۔ میں نے انہیں مطلع کیا کہ ہم نے بیرونی سرمایہ کاری کیلئے سازگار فضا بنالی ہے۔ یہ مستعد اور باہمت افراد کیلئے کھلا موقع ہے کہ وہ ہمارے مساعی میں ریاست کو اسلامی سماجی انصاف کے پس منظر پر مبنی مثالی ریاست بنانے کیلئے شریک ہوں۔"

پہلے وہ ایران گئے، وہاں پر تجارتی معاہدہ طے کیا:

"پہلے میں ایران گیا اور وہاں اپنے قیام کے دوران ایران کے وزیر امور تجارت سے ملا، ان سے تجارت کے فروغ کے سوال، دوستی اور تجارت کے طے شدہ سمجھوتے کے مسودے پر گفتگو کی اور مجھے مسرت ہے کہ یہ سمجھوتہ اب طے پا چکا ہے۔"

اس کے بعد وہ ترکی گئے۔ وہاں کی وزارت تجارت کو تجارتی فروغ کیلئے تجاویز پیش کیں، وہاں سے وہ فرانس گئے، تجارتی تعلقات کے فروغ کیلئے نئی راہیں تلاش کرنے پر اتفاق کیا، برطانیہ گئے، کینیڈا گئے وہاں پر انہوں نے اپنی تجاویز پیش کیں، وہاں سے نیویارک اقوام متحدہ کی اسمبلی میں شرکت کی۔ علاوہ ازیں بڑے بڑے صنعت کاروں اور تجارت پیشہ لوگوں سے گفتگو کی، وہ بوسٹن بھی گئے، کیونکہ وہاں بھی پاکستانی برآمدات جاتی تھی۔ اس ساری گہما گہمی اور سرگرمی سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وزارت تجارت کا قلمدان سنبھالنے کے بعد انہوں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے اہم ستون اقتصادیات کے میدان میں ملکی مفادات میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ یہ

www.bhutto.org

وہ دور تھا کہ جب امریکہ "Buy America" (امریکی اشیاء خریدو) کی پالیسی پر کام کر رہا تھا، انہوں نے اس پالیسی کی مخالفت کی اور کہا کہ اس پالیسی کا ہم جیسے ترقی پذیر اور امداد لینے والی اقوام پر منفی اثر پڑے گا۔ یہ بھی کہا کہ یہ پالیسی بین الاقوامی تجارت کی ناکہ بندی کردے گی۔

یہ وہ دور تھا جب پاکستان اقتصادی میدان میں نئے راستے تلاش کر رہا تھا، گوکہ بین الاقوامی سطح پر شہید بھٹو نے پاکستان کا ایک معاشی خاکہ پیش کیا تھا، مگر گھر میں حالات کیا تھے، ان کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''یہ تمام مذاکرات بہت مفید ثابت ہوئے لیکن آج ہمیں پیداوار اور اس کے بحران کا سامنا ہے، ہماری برآمدی منڈیاں لامحدود ہیں، لیکن پیداوار میں کمی کے باعث ہم عالمی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے۔''

ان حالات کے باوجود بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری اور اقتصادی میدان میں پاکستان کی بہتری کیلئے جدوجہد کرتے رہے۔ وہ پیدائشی فاتح تھے۔ قدرت نے ان کو ایسی صلاحیت دی تھی، کہ وہ ہر مصیبت کا دریا پار کر جاتے تھے اور چیلنج کا سامنا کرنے سے نہیں گھبراتے تھے۔ انہوں نے معاشی میدان میں بہت سارے کامیابیوں کے نشانات چھوڑے اور اقتصادیات کے شعبہ میں بہتری اور عالمی تعلقات پیدا کرنے کیلئے ایسی بنیادیں ڈالیں، کہ جن پر آج پاکستان کھڑا ہے۔

گوکہ وزیر تجارت تھے، لیکن خارجہ پالیسی کی گتھیاں سلجھاتے نظر آئے اور مختلف عالمی امور پر اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے، یہ ان دنوں کی بات ہے، جب یورپ اور امریکہ کے کچھ دانشوروں نے ترقی پذیر اور پس ماندہ ممالک کے خلاف نفرت کا اظہار کیا اور انہیں خیرات پر پلنے والی اقوام قرار دیا۔ قائد عوام نے اس مسئلے پر قلم اٹھایا اور ''کیا غیر ملکی امداد خیرات ہے'' کے عنوان سے اکتوبر ۱۹۶۱ء کو ایک تفصیلی مضمون لکھا، یہ ایک یادگار مضمون ہے، جو کہ امریکہ اور مغرب کے سامراجی کردار کا احاطہ کرتا ہے۔

یہ کام اس وقت دفتر خارجہ سے منسلک کسی منصبدار کو کرنا چاہیے تھا، لیکن یہ ذمہ داری

www.bhutto.org

انہوں نے اپنے ہاتھوں میں لی اور امداد کو خیرات کہنے والوں کو مدلل انداز سے بتایا کہ یہ امداد اصل میں کیا ہے؟ اس کے علاوہ انہوں نے یہ مضمون لکھ کر بھی ترقی پذیر اور پس ماندہ ممالک کا کیس لڑا اور ان کا دفاع کیا، جن کے خلاف توہین آمیز پروپیگنڈہ کیا جا رہا تھا۔ قائد عوام اپنے اس شاندار مضمون کی شروعات اس طرح سے کرتے ہیں:

''اقتصادی امداد دوسری جنگ عظیم کے بعد نمود پذیر ہوئی۔ یورپ کی راکھ پر امریکہ کی بے پناہ امداد کے ذریعے ایک نئی صنعتی طاقت پیدا کی گئی اور امریکہ جنگ میں ملوث ضرور تھا، لیکن تباہی سے محفوظ رہا۔''

اس کے بعد بھٹو صاحب امریکہ کی اس فیاضی کا اصل راز بتاتے ہیں کہ یورپ کو یہ امداد کیوں دی گئی:

''یورپ کی تعمیر نو کا مقصد محض اتنا نہ تھا کہ تباہ شدہ ملکوں کے کھنڈرات پر نئے چرچ اور فنون لطیفہ کے نئے ادارے قائم کئے جائیں، اصل مقصد یہ تھا کہ یورپ کو کمیونزم کی وہیل کے منہ میں جانے سے بچایا جائے۔ اگر مغربی یورپ کمیونزم کے زیر اثر آ جاتا تو براعظم امریکہ کی طرف اس کی پیش قدمی اتنی ہی یقینی ہوتی جتنی کہ اس ٹڈی دل کی ہوتی ہے جو صحرائے عرب سے ہوتا ہوا براعظم پاک و ہند اور وسطی چین میں داخل ہوتا ہے۔''

وہ آگے لکھتے ہیں کہ صدیوں سے غیر ایشیائی لوگوں نے ایشیا کی دولت کو لوٹا ہے۔ اس طرح ایشیا بھوکا اور ننگا ہونے لگا، یہاں کے کھیت تو زرخیز ہیں، لیکن عوام غریب ہیں، بیماری ایک ورثے کی صورت اختیار کر گئی ہے اور یہ ایشیا ہے جہاں ''مراعات یافتہ طبقے کے مہین پردے کے پیچھے غمگین انسانیت کا مصیبت زدہ سمندر ہے'' ایسی صورتحال میں وہ ایشیا کا سارا مال و دولت واپس دینے کا مطالبہ کرتے ہیں:

''اس بات میں شبہ کی گنجائش ہے کہ بنی نوع انسان کا اجتماعی ضمیر طویل عرصے تک ایسے حالات زندگی کو برداشت کرتا رہے گا، ایشیائی قیادت کا نعرہ دائمی اجتماعی افلاس کے دھبے کو دھونا ہے۔

www.bhutto.org

اس عظیم ترین چیلنج پر قابو پانے کیلئے ہر شخص کو کمر بستہ ہو جانا چاہیے۔ انفرادی سطح پر تمام تر ممکن قربانیاں مسائل کو چھو تک نہیں سکتیں۔ صدیوں تک غیر ایشیائی لوگوں نے ایشیا کی محنت پر گزارہ کیا اور غریب امیر ہو گئے۔ سورج سے محروم، ریشم سے محروم اور گرم مسالوں سے محروم بحر اوقیانوس کے معاشرہ کی مشرقی دولت کو ہڑپ کر جانے کی بے پناہ ہوس نے ہمیں کنگال کر دیا۔ یہ مسئلہ ان کا بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ ہمارا۔ انہیں کم از کم جزوی طور پر ایشیا کو وہ سب کچھ واپس کر دینا چاہیے جو اس کی ملکیت تھا۔"

اس موقعہ پر قائد عوام پوری ایشیائی نسل کے وکیل نظر آتے ہیں، اور شواہد پیش کرتے ہیں کہ بحر اوقیانوس کے معاشرے اور محروم علاقے اگر آج بادشاہوں جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں تو یہ دولت درحقیقت ایشیا کے لوگوں کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی مدبر کی حیثیت سے بیرونی امداد کو مؤثر قرار دیتے ہیں اور ان کے فوائد کی نشاندہی کرتے ہیں:

"اس بات کا بلا توقف اعتراف کر لینا چاہیے کہ غیر ملکی امداد کے بغیر دوسرے منصوبے کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ بیرونی سرمایہ ہی اندرونی سرمائے کے مؤثر استعمال کیلئے محرک انگیز ذریعہ کا کام دے سکتا ہے۔ اس کا زیادہ تر حصہ قبل از سرمایہ کاری سرگرمیوں مثلاً تعلیم اور صحت کی سہولیات کی فراہمی، رابطہ کی سڑکوں اور ذرائع رسل و رسائل کی تعمیر اور تحقیق پر صرف ہوگا۔ یہ وہ سرگرمیاں ہیں، جو معیشت کا بنیادی ڈھانچہ بناتی ہیں اور اسے پیداواری سرمایہ کاری کیلئے تیار کرتی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسی سرمایہ کاری محاصل پیدا نہیں کرتی اور زیادہ شرح سود والے قرضے امدادی رقوم کا قابل عمل بدل نہیں ہو سکتے۔"

قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو مسائل سے اچھی طرح باخبر تھے اور ان کے اسباب کی بھی انہیں جان کاری تھی۔ جس کا ذکر اوپر کیا گیا، اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے امریکہ اور یورپ کی ایشیا میں سیاسی اور معاشی مداخلت اس لئے نہیں ہے کہ اس افلاس زدہ خطہ کو مسائل کے دلدل سے نکال کر ترقی کی شاہراہوں پر لایا جائے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ایشیا کو غریب ہی رکھا جائے اور یہاں کے وسائل کی لوٹ مار کے بدلے انہیں اتنی امداد دی جائے کہ بس یہاں کے عوام زندہ رہ سکیں۔ ایشیا کو

www.bhutto.org

غریب رکھنے کی گھناؤنی پالیسی کا اصل راز قائدعوام نے ہمیں بتایا:

"یہاں یہ مستقل سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ اور یورپ ایشیا کی غربت کا ازالہ کیوں کریں؟ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ دنیا کو جارح بین الاقوامی کیمونزم کا شکار ہونے سے بچایا جائے۔"

اب ہم آتے ہیں قائدعوام کے وزارت معدنیات اور قدرتی وسائل کے زمانے کے اس عظیم کارنامے کی طرف، جس سے آج تک ہمارا ملک فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ۴- مارچ ۱۹۶۱ء کو پاکستان اور روس نے تیل کی تلاش کے معاہدہ پر دستخط کئے۔ تیل کی تلاش کے سلسلے میں روس نے پاکستان کو ۱۹۵۹ء میں پیشکش کی تھی۔ پاکستان نے اس کو قبول کیا، اس کے بعد روسی ماہرین آئے اور تیل کی تلاش کا ایک پروگرام بنایا گیا۔ یہ معاہدہ معمولی نوعیت کا نہیں تھا، اس وقت دنیا دو واضح بلاکوں، کیمونسٹ بلاک اور مغربی بلاک میں بٹی ہوئی تھی۔ پاکستان سیٹو اور سینٹو جیسے معاہدوں کا رکن تھا، جو کہ کیمونسٹ بلاک کا مقابلہ کرنے کیلئے بنائے گئے تھے۔ پاکستان کو امریکہ کا اتحادی سمجھا جاتا تھا، جب کہ امریکہ اور روس کے مابین سرد جنگ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ ایسی صورتحال میں یہ بھٹو ہی تھے، جنہوں نے اپنی ذاتی دلچسپی سے یہ کارنامہ سرانجام دیا، اگرچہ صدر ایوب خان اور ان کی ٹیم اس معاہدے کے خلاف تھی۔ یہ معاہدہ طے پایا، تو پاکستان اور روس کے تعلقات میں بہتری آئی۔ آگے چل کر روس نے کراچی میں فولاد کا عظیم الشان کارخانہ اپنے خرچ پر تعمیر کیا۔

جب قائدعوام حکومت میں شامل ہوئے تو اس وقت اندرونی سطح پر سیاسی تناؤ موجود تھا، متحدہ پاکستان کے دونوں حصوں میں ایک خلیج پڑ گئی تھی، جو گزرتے دنوں کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ اقتدار پرستی کی ہوس کی فضا پورے ملک پر چھائی ہوئی تھی۔ ایوب خان ملک پر راج کر رہے تھے۔ اس وقت پاکستان کو سنبھلنے کی کوئی راہ نہیں سوجھ رہی تھی۔ انہی حالات میں قائدعوام حکومت میں شامل ہوئے۔

وہ ایک نیا پاکستان بنانا چاہتے تھے اور اقوام عالم میں اس کا ایک باوقار درجہ دیکھنا چاہتے

www.bhutto.org

تھے۔ لیکن دشواریاں بہت تھیں، جن کا ذکر انہوں نے مضمون 'پاکستان اور بیرونی معاہدے' میں کیا ہے۔ یہ مضمون اس وقت لکھا گیا جب بھٹو صاحب پاکستان کے وزیر خارجہ نہیں رہے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام عمل میں آچکا تھا اور ایک سال کے اندر عام انتخاب ہونے والے تھے۔ یہ مضمون علمی نوعیت کا ہے اور خارجہ پالیسی سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ اسے پڑھ کر یہ جان سکیں گے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کیا تھی یا اسے کیسا ہونا چاہیے تھا۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی گھٹن کا شکار تھی، جسے بدلنے کی اشد ضرورت تھی۔ معاشی پھیلاؤ ایک مخصوص دائرے سے باہر نکل نہیں رہا تھا، اسی حالت میں قائد عوام نے اسے اپنے ہاتھوں میں لیا اور نئی سمتیں اور نئے راستے دریافت کیے۔ انہوں نے لکھا کہ:

"کسی کی خارجہ پالیسی کو اس کی غایت کے حوالے سے دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ اس کی پرکھ کیلئے اصولوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے، جن کے تحت خارجہ پالیسی تشکیل کی جاتی ہے۔ ان اصولوں کی حقیقت تک پہنچنا، کسی ریاست کی ظاہری صورت سے کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اگر دوطرفہ معاہدے کی شرائط ریاست کے معروف اصولوں سے متصادم ہوں تو دوطرفہ معاہدوں کی حمایت اپنے آپ باطل ہو جاتی ہے۔ اس طرح اگر یہ خدشہ ہو کہ چوطرفہ تعلقات ملک کے حالات اور مفادات کے معیار پر پورے نہ اتریں گے تو انہیں ختم کر دینا چاہیے..... ایک ایسا معاہدہ جس میں کئی قومیں شامل ہوں وہ دو قوموں کی مفاہمت اور تعلقات کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ اور ناقابل عمل ہو جاتا ہے۔"

شہید بھٹو کثیر الملکی معاہدوں کے حق میں نہیں تھے خاص طور پر اس وقت جب وہ کسی بڑی طاقت کی خوشی اور رضامندی کیلئے کیے گئے ہوں۔ امریکہ نے جو چوطرفہ معاہدے امن کے نام پر شروع کیے تھے انکے پیچھے اس کا ذاتی مفاد موجود تھا۔ اس سلسلے میں قائد عوام کا کہنا ہے کہ:

"امریکہ نے امن کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ایسے باہمی طور پر مربوط چوطرفہ حمایت کے معاہدوں کا سلسلہ شروع کیا، جو سوویت یونین اور عوامی جمہوریہ چین کے خلاف تھے۔ مغربی یورپ کے تحفظ کیلئے نیٹو جیسے باہمی حمایت کے ادارے کو قائم کیا گیا۔ نیٹو کے نقش قدم اور

www.bhutto.org

معاہدت میں مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرق ایشیا میں سیٹو اور سینٹو کے ادارے قائم کئے گئے اور پاکستان ان میں شامل ہوگیا۔ پاکستان نے اپنے طور پر ان چوطرفہ معاہدوں اور پابندیوں کے بدلے میں ریاست ہائے امریکہ کے ساتھ ایک علیحدہ دوطرفہ قومی معاہدہ کرلیا اور یوں ایشیا دوطرفہ معاہدوں کے حوالے سے پاکستان، ریاست ہائے متحدہ کی اور اس کے حلیفوں کی طرف سے اس سرد جنگ میں شریک ہوگیا جو سوویت یونین اور اس کے ساتھی ملکوں کے خلاف لڑی جارہی ہے۔"

یہ چوطرفہ معاہدے بظاہر اجتماعی دفاعی معاہدے تھے اور خاص طور پر کیمونسٹ ممالک کے کسی بھی حملے یا جنگ کا جواب دینے کیلئے طے پائے تھے۔ لیکن وہ اپنا مطلوبہ مقصد پورا کرنے میں اس لئے ناکام رہے کہ یہ معاہدے دراصل دو بڑی طاقتوں، سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان چلنے والی سرد جنگ کو اپنے حق میں کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ اُس وقت دنیا یا تو سوویت یونین کی طرف تھی یا امریکہ کی طرف۔ جبکہ تیسری طرف غیر وابستہ ممالک تھے، جو کہ دونوں بڑی طاقتوں سے متوازن تعلقات کے خواہاں تھے۔ سرد جنگ کی ایسی صورت حال پر قائد عوام نظر رکھے ہوئے تھے اور وہ جان چکے تھے کہ مستقبل قریب میں جمہوریہ چین ایک سپر پاور کے روپ میں ابھر کر سامنے آئیگا، اور امریکہ اور روس پر سبقت حاصل کرجائیگا:

"عالمگیر تباہی کو تو چوطرفہ فوجی معاہدوں کے جال سے نہیں روکا گیا ہے بلکہ عالمگیر تباہی اس دوطرفہ فوجی توازن کے وجود سے روکی گئی ہے جو سوویت یونین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ایک نئی صورت حال جو قابل تصور اتفاقات سے لبریز ہے اس وقت جنم لے گی، جب چند سالوں کے اندر اندر چین دونوں بڑی طاقتوں پر فوجی طاقت کے اعتبار سے فوقیت حاصل کر جائے گا۔"

وقت نے قائد عوام کی اس پیش گوئی کو درست ثابت کیا ہے جو انہوں نے آج سے کوئی ۳۷ برس پہلے کی تھی۔ آج جمہوریہ چین اقوام عالم میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ گزشتہ دہائیوں میں بہت بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، جن میں سے اہم ترین تبدیلی سوویت یونین کا ٹوٹنا ہے۔ اس

www.bhutto.org

کے بعد امریکہ طاقت کا اکیلا مرکز بن گیا ہے۔ گو کہ اقتصادی میدان میں چین نے مرتے کو۔ منڈی میں پیچھے چھوڑ دیا ہے، پھر بھی جنگی اسلحہ اور دوسرے ساز و سامان کے میدان میں امریکہ چین سے آگے ہے۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان نچلی سطح کی سرد جنگ چل رہی ہے۔ امریکہ کی ہر ممکن کوشش ہے کہ وہ چین کی بڑھتی ہوئے طاقت کو روکے، اس لئے اس نے بھارت کو بیچ میں لاکر کھڑا کر دیا ہے تاکہ چین بھارت سے الجھا رہے اور امریکہ سے چلنے والے عالمی مقابلہ بازی کے خیال سے کنارہ کش ہو جائے۔ امریکہ کی ہر ممکن کوشش ہے کہ وہ ایشیا میں چین کے ہم پلہ کوئی قوت پیدا کرے، اسی سلسلہ میں اس نے بھارت کے ساتھ ایٹمی معاہدہ کیا ہے۔ ان ساری رکاوٹوں کے باوجود ایسا لگ رہا ہے کہ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کی چین کیلیئے پیش گوئی جلد حقیقت بن کر سامنے آئے گی۔

اپنے اس مضمون میں قائد عوام یہ بتاتے ہیں کہ امریکہ کی عالمی خارجہ پالیسی کا واحد اصول یہ ہے کہ دنیا کے اکثر ممالک کو دو طرفہ اور چو طرفہ معاہدوں میں جکڑ کے رکھا جائے۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان بیک وقت بہت ساری دو طرفہ اور چو طرفہ معاہدوں میں الجھا ہوا ہے، اور اس الجھاؤ نے ایک جال کی سی صورت اختیار کر لی ہے:

"ایوب خان کا یہ دعویٰ کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی دو طرفہ پالیسی کی خطیر ہے۔ ایک بہت بڑا فریب تھا پاکستان سیٹو اور سینٹو کا رکن ہے۔ دولت مشترکہ میں شامل ہے۔ کولمبو پلان میں شریک ہے اور قرضوں کیلیئے کنسورشیم کا رکن ہے۔ اس قسم کے چو طرفہ معاہدوں کے جال کو شاید ہی کسی صورت میں ایک مثالی دو طرفہ پالیسی کا نام دیا جا سکتا ہو۔"

یہ بات درست ہے کہ امریکہ کل بھی بہت بڑی طاقت تھا اور آج بھی ہے۔ وہ اپنے مفادات کیلیئے مختلف خطوں اور ملکوں کو استعمال کرتا آیا ہے۔ قائد عوام یہ بات بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ امریکہ صرف اپنے مفادات کا کھیل کھیلتا ہے اور مفاد پورا ہونے کے بعد مختلف ممالک کو اپنے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے، اور کبھی کبھار دشمنی پر بھی اتر آتا ہے۔ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں توازن آج تک نہیں دیکھا گیا۔ ہوتا یوں رہا ہے کہ امریکی اشارے پر حکومتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔

www.bhutto.org

جب کبھی اسے ضرورت پڑی اس نے پاکستان کو استعمال کیا اور پھر چھوڑ دیا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو امریکہ نے پاکستان کو دیے جانے والے فوجی آلات پر پابندی لگادی گو کہ پاکستان اس کا اتحادی سمجھا جاتا تھا اور سیٹو اور سینٹو میں اس کا ساتھی تھا۔ شہید بھٹو نے اس بارے میں یوں لکھا ہے:

''ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے پاکستان کو دیے جانے والے فوجی آلات پر اس وقت پابندی لگادی جب کہ پاکستان اپنے سے پانچ گنا زیادہ طاقتور ملک کی جارحیت کی خلاف اپنی بقاء کیلئے جدوجہد کر رہا تھا۔ تین سال تک پاکستان کیلئے اسلحہ اور فاضل پرزہ جات کی خرید پر مکمل پابندی عائد کردی اور اس حکومت کو جو تین فوجی تنظیموں کی حلیف تھی، اسے اسلحہ اور فاضل پرزہ جات کے حصول کیلئے در بدر بھٹکنا پڑا اور اسے کالے بازار اور اسلحہ کے بدنام تاجروں سے رابطہ کرنا پڑا۔

ان کٹھن مراحل اور نازک وقت میں بھی ایوب خان نے ملک کو غیر ممالک کے ساتھ کیے ہوئے بے جان اور بے کار معاہدوں کا بوجھ سے آزاد کرنے سے انکار کردیا۔ اس کے برعکس اس نے ریاست ہائے متحدہ کو یہ رعایت دے رکھی تھی کہ وہ پشاور میں فوجی اڈہ جولائی ۱۹۶۹ء تک قائم رکھے۔''

۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کی طرف امریکی رویہ کو سامنے رکھتے ہوئے جنرل ایوب خان کے پاس کوئی جواز نہ رہا تھا جس کے بنیاد پر وہ امریکہ کو پاکستان میں فوجی اڈہ قائم رکھنے کی مزید اجازت دیتا، جو کہ سوویت روس کی نظرداری کرنے کیلئے قائم کیا گیا تھا۔ یہ ایک نازک وقت تھا جب امریکہ کو پاکستان کا ساتھ دینا چاہیے تھا، کیونکہ اس سے پہلے ۱۹۵۹ء کو دونوں ممالک کے درمیان معاہدے طے ہوا تھا، جس میں امریکہ نے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ پاکستان کی آزادی اور ترقی کی مقاصد کے استحکام کیلئے پاکستان کی مدد کریگا۔ دوسری طرف امریکہ کا بھارت کے ساتھ رویہ پاکستان کے بالکل برعکس تھا، جنگ ۱۹۶۲ء میں بھارت-چین جھڑپ عمل میں آئی تو امریکہ نے بھارت کی مدد کیلئے بھاری اسلحہ اور جنگی ساز و سامان بھیجا۔ پاکستان نے اس معاملے پر احتجاج کیا، جس پر امریکہ نے یقین دہانی کراتے ہوئے کہا تھا کہ ''پاکستان پر کسی بھی غیر ملکی حملے کی صورت میں امریکہ پاکستان

www.bhutto.org

کی مدد کریگا خواہ وہ بھارت ہی کیوں نہ ہو۔"

یہاں پر آپ با آسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ امریکہ نے پاکستان اور بھارت سے تعلقات میں ہمیشہ بھارت کو ترجیح پر رکھا ہے حالانکہ بھارت براہ راست امریکہ کا اتحادی نہیں سمجھا جاتا تھا جبکہ پاکستان بہت سارے دوطرفہ اور کثیر الملکی معاہدوں میں امریکہ کے ساتھ تھا۔ قائد عوام نے اپنے اس مضمون میں ایوب خان کی بزدلی اور فیصلہ نہ کر پانے والی کمزوری کو بھی بے نقاب کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ اگر صدر ایوب کو ان معاہدوں سے زیادہ دلچسپی نہ رہی تھی تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان سے پاکستان کو خطرہ لاحق تھا، بلکہ صدر ایوب کی دلچسپی اس لئے کم ہو گئی تھی کہ امریکہ کو ان معاہدوں سے زیادہ دلچسپی نہ رہی تھی۔ صدر ایوب اسی انتظار میں تھے کہ کب امریکی حکومت ان معاہدوں کو ختم کرتی ہے۔"

اس ساری بحث سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ پاکستان ایسے بیکار معاہدوں میں پھنسا ہوا تھا جو کہ اس کیلئے سودمند نہ تھے۔ یہاں تک کہ اس کی ملکی سلامتی کے معاملے میں بھی مددگار ثابت نہ ہوئے۔ جب کہ دوسری جانب ان امریکی معاہدوں کیلئے پاکستان نے کیا کیا کھویا اور کن کن مشکل حالات سے گذرا، یہ منظر نامہ چیئرمن بھٹو نے یوں پیش کیا ہے:

"پاکستان کے حلیفوں نے نہ صرف ہمسایہ کمیونسٹ ممالک کو پاکستان کا مخالف بنایا بلکہ پاکستان کا ہر غیر جانبدار ہمسایہ ملک بھی پاکستان کے بارے میں بدگمان ہو گیا تھا۔ برما جو اپنی سرحد کے چند جزیروں کی ملکیت کے سلسلے میں الجھا ہوا اپنی غیر جانبداری کو بحال کرنے میں پریشان تھا، اسے پاکستان کے سینٹو کے ممبر بن جانے سے تشویش پیدا ہوئی۔ افغانستان نے سرد جنگ میں پاکستان کے وعدوں اور کردار کو دیکھا تو اس نے اپنے بہتر مفادات کیلئے غیر جانبدار اور اشتراکی ممالک کے ساتھ روابط پیدا کر لئے۔ انڈونیشیا جو ایک تہلکہ خیز غیر جانبدار پالیسی کا حامل تھا، اس نے پاکستان کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار بھارت کے ساتھ تعلقات کے فروغ کی صورت میں کیا۔ مشرق

www.bhutto.org

وسطیٰ کی عرب ریاستوں نے پاکستان کی سینٹو میں شمولیت کو عرب ممالک کے تحفظ کے خلاف ایک خطرہ محسوس کیا۔ اسی زمانے میں بھارت نے نیپال، سکم اور بھوٹان پر اپنی جاگیردارانہ نوعیت کی ملکیت کا دعویٰ کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پاکستان ہمسایہ ممالک کو اپنے دوستوں میں شمار نہ کر سکے۔ اب ہمارے دو ہی ہمسایہ ممالک باقی رہ گئے تھے۔ چین اور ایران۔ بنیادی طور پر سینٹو کی تشکیل چین ہی کے خلاف تھی۔ اس لئے پاکستان کیلئے یہ ایک کٹھن کام تھا کہ وہ ایک ایسے ملک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر سکے جسے پاکستان کے حلیف ممالک ناپسند کرتے تھے۔ اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سوائے ایران کے، پاکستان کے تعلقات اپنے تمام ہمسایوں کے ساتھ غیر تسلی بخش تھے اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کا تعلق سیٹو اور سینٹو سے تھا۔"

اتنے بھاری نقصانات اٹھانے کے بعد بھی جنرل ایوب خان ان ناکام معاہدوں سے الگ ہونے کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک فوجی تھا جو کہ اقتدار پر قابض ہوا تھا، اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ جب تک امریکی آشیرباد اسے حاصل رہے گا، وہ اقتدار پر بدستور رہے گا۔ قائد عوام بھٹو پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں مفادات کی غیر متوازن کیفیت اور الگ تصورات کی نشاندہی کرتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ دونوں ملکوں نے مشترکہ مفادات کے بجائے اپنے اپنے مختلف فوائد کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ کر رکھا تھا جس کا نتیجہ ان کے تعلقات کی ناکامی کی صورت میں نکلا۔ وہ بتاتے ہیں کہ:

"امریکہ نے پاکستان کو ان معاہدوں میں چین اور روس کے خلاف اپنی عالمی پالیسی کے ایک شریک کی حیثیت سے شامل کیا۔ پاکستان ان معاہدوں میں اس لئے شریک ہوا تھا کہ وہ بھارتی جارحیت کے خلاف اپنے تحفظ کیلئے فوجی امداد اور تحفظ حاصل کر سکے۔ وہ ان معاہدوں میں اس لئے شریک نہ ہوا تھا کہ اسے سوویت یونین یا چین کے خلاف کوئی دشمنی تھی۔ اس بنیادی بے قاعدگی کی وجہ سے اس نے ہر جانبدار ملک کے مقابلے میں تلخ ترین فصل کاٹی۔ پاکستان کو اپنے عملی تضاد کا تجربہ ۱۹۶۵ء میں بھارتی جارحیت کے دوران ہوا۔ پاکستانی عوام نے فوجی امداد کے مفاد کے باوجود اس

www.bhutto.org

جانبداری کی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ اگر پاکستانی عوام کو یہ حق دیا جاتا کہ وہ فوجی امداد سے منسلک جانبدارانہ پالیسی یا فوجی امداد سے محروم غیر جانبدار اور آزادانہ خارجہ پالیسی کا انتخاب کریں تو بلاشبہ پاکستانی عوام آزاد خارجہ پالیسی کے حق میں فیصلہ دیتے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ایوب حکومت نے اس وقت بھی سیٹو اور سینٹو سے علیحدہ ہونے سے انکار کر دیا جبکہ فوجی امداد کو بند ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ ایوب خان کے آخری وزیر خارجہ مسٹر ارشد حسین نے حکومت کی پالیسی کے بارے میں، راولپنڈی میں قومی اسمبلی میں بیان دیتے ہوئے ۲۸۔ جون ۱۹۶۸ء کو یہ تسلیم کیا کہ جانبدارانہ پالیسی ناکام ہو چکی ہے۔"

تو حکومت پاکستان یہ فیصلہ سنا چکی کہ جانبدارانہ خارجہ پالیسی ناکام ہو گئی ہے، اس سے پاکستان کو کچھ بھی حاصل نہ ہوا تھا، اس موقع پر ذوالفقار علی بھٹو آگے آ کر ایک بار پھر ملک کے مفادات کے خاطر درست سمت میں رہنمائی کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ پاکستان کو بے کار اور دور دراز کے مختلف القاصد ممالک کے ساتھ معاہدوں کے بجائے فطری اور اصولی معاہدوں کی پرورش کرنی پڑے گی اسی صورت میں پاکستان کی سلامتی اور خود مختیاری یقینی ہو سکتی ہے۔ قائد عوام بھٹو غیر جانبدار خارجہ پالیسی کی ناکامی کے بعد ایک نئی تجویز پیش کرتے ہیں:

"پاکستان اس وقت تک اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا، جب تک وہ مخالف طاقتوں میں متوازن مقام حاصل نہیں کر لیتا۔ بنیادی طور پر یہ توازن ایشیا پر مرکوز خارجہ پالیسی کے احیاء سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے ہم ایشیا کا ایک حصہ ہیں اور یہ ایک غیر متبدل اور مستقل حیثیت ہے۔ جب تک ہم مختلف مقاصد رکھنے والے، دور دراز کے علاقوں اور ملکوں کے ساتھ، اپنے وسائل سے باہر، پابندیوں، تعلقات اور معاہدوں میں جکڑے الجھے ہوئے ہیں، اس وقت تک ہم ایشیا میں اپنا مقام پیدا نہیں کر سکتے۔"

یہاں پر آپ یہ بات واضح طور پر محسوس کر سکتے ہیں کہ اب قائد عوام بھٹو علاقائی اتحاد کی طرف توجہ دینے لگے اس کا پس منظر اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ دور دراز ممالک کے ساتھ مختلف

www.bhutto.org

القاصد تعلقات کو اندھیروں میں بھٹکنا شمار کرتے تھے اس لئے انہوں نے فطری اور اصولی خارجہ پالیسی وضع کرنے پر زور دیا۔ فطری اس معنی میں کہ ایشیا کو ایک ہو جانا چاہیے اور اصولی اس معنی میں کہ اپنے حقیقی اتحادیوں سے متوازن تعلقات قائم کئے جائیں۔ ان دونوں چیزوں کو ملا کر انہوں نے تیسری دنیا کا نظریہ پیش کیا کہ دنیا کے غریب اور پسماندہ ممالک ہی ایک دوسرے کے فطری تعلقات استوار کر سکتے ہیں اور اپنے تعلقات کے اصولوں میں ایک توازن پیدا کر سکتے ہیں۔ دراصل وہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ایک نئی عالمی طاقت کے احیاء کو ممکن بنانا چاہتے تھے جو کہ تیسری دنیا کے ممالک کے اتحاد سے ہی ممکن تھا۔ اس سلسلے میں وہ اپنی معروف و مشہور تحریر "دوطرفہ تعلقات کا نظریہ۔ نئی سمتیں" میں لکھتے ہیں کہ:

"تیسری دنیا اپنی تمام قوتوں کے ساتھ جو آج تک منتشر رہی ہیں، ایک نکتہ پر مجتمع ہو۔ یہ اتحاد دولت مند ملکوں کے ساتھ ٹکرانے کیلئے نہیں بلکہ ناانصافیوں کے خاتمے کیلئے اور کسی خاص نظام کی تباہی کیلئے نہیں بلکہ موجودہ غیر منصفانہ توازن کی اصلاح کے ذریعے ایک نئے اقتصادی نظام کی تعمیر کیلئے ہوگا۔ ایسی کوئی تحریک، دھڑے بندی یا حکمت عملی جو اس عظیم منصفانہ نصب العین کیلئے تیسری دنیا کے اتحاد میں رکاوٹ بنے گی، وہ اس الزام سے ہرگز محفوظ نہ ہوگی کہ اس نے تنگ تر ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے، تاریخی عوامل کو نظر انداز کیا اور وقت کے چیلنج کا حقیقت پسندی لیکن تعمیری انداز میں جواب دینے کیلئے جو قوتیں آگے بڑھیں، ان کے راستے مسدود کئے۔ یہی عوامل ہیں جنہیں ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں نے حال ہی میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ترقی پذیر ممالک کی ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس منعقد کرنے کی اپیل کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تیسری دنیا کے اس جامع فورم کو غیر جانبداری کے تصور کے منافی نہیں بلکہ اس کی توسیع اور ارتقا سمجھا جائے گا۔"

یہاں تک پہنچتے پہنچتے آپ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ پاکستان میں غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی کے بانی قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ انہوں نے پاکستان کیلئے کثیر الملکی تعلقات کے بجائے دوطرفہ تعلقات پر زور دیا۔ وہ پاکستان کو امریکہ یا کسی اور بڑی طاقت کا غلام بنتا نہیں دیکھ سکتے

www.bhutto.org

تھے اس لئے وہ معاہدات اور تعلقات میں ایک توازن کے قائل تھے۔ انہیں اس بات کا پتہ تھا کہ ایک کمزور ملک اور ایک طاقتور ملک میں متوازن تعلقات پیدا ہونا مشکل بات ہے۔ اس لئے انہوں نے فطری اور اصولی خارجہ پالیسی پر زور دیا۔ وہ صرف پاکستان کے ہی واحد ایسے لیڈر نہیں تھے کہ جو اپنے ملک کے مفادات کو ہی سب کچھ جانے، وہ تیسری دنیا کے بھی بہت بڑے لیڈر اور مفکر مانے جاتے ہیں۔ تیسری دنیا کے اصطلاح کی تخلیق اور نظریہ ان کے ہی ذہن کی پیداوار تھا۔

یہاں پر ہم بات چیت کو آگے بڑھاتے ہوئے قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کے خارجہ پالیسی کے میدان میں عملی کارناموں کا ذکر کریں گے۔ اس ضمن میں ہمیں خود کچھ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی کیونکہ ان کی تقاریر میں یہ سب باتیں موجود ہوتی ہیں۔ آیئے سب سے پہلے اس تقریر کے اقتباس کی طرف چلتے ہیں جو کہ انہوں نے ۱۷ جنوری ۱۹۷۰ء کو لیاقت گارڈن راولپنڈی میں کی تھی:

''میں آپ سے ہماری خارجہ پالیسی کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہوں گا، میں یہ ذکر ۱۹۶۲ء سے شروع کروں گا۔ یہ سال بھارت چین جنگ کا سال تھا، اس سے پہلے دونوں ممالک قریبی دوست تھے، بھارت عالمی برادری میں چین کی حمایت کرتا چلا آ رہا تھا جبکہ پاکستان اور چین کے تعلقات میں تناؤ موجود تھا جس کا سبب یہ تھا کہ پاکستان سیٹو اور سینٹو کا ممبر تھا اور ایک عظیم طاقت کے غلام کا کردار ادا کر رہا تھا اور اس کی مدد پر ہی دارومدار رکھتا تھا۔

ہماری خارجہ پالیسی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ آمریت کے سائے میں ملک چلایا جا رہا تھا۔ ایک اکیلا حکمران ہر ایک معاملہ میں مختار کل تھا۔ نہ صرف چین بلکہ سوویت یونین بھی پاکستان کے خلاف تھا، مسلم دنیا کے ساتھ ہمارے تعلقات بے ترتیب تھے، میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت اپوزیشن لیڈر کہاں تھے جب میں وزیر خارجہ بنا تو اپنے مسلمان ہمسائے افغانستان کے ساتھ تعلقات بہتر بنائے، کیونکہ پاکستان جیسے بڑے اسلامی ملک کیلئے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنے ہمسایہ مسلم ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔

www.bhutto.org

آپ کو یاد ہوگا جب ۱۹۶۲ء میں بھارت چین جنگ چھڑ چکی تھی تو ایوب خان ہنزہ میں سیر وتفریح میں مصروف تھے۔ اس وقت اخبارات میں ایک تصویر شائع کی گئی تھی، جس میں ایوب خان ایک خچر پر سوار ہے۔ سامنے ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ ہے، آسام پر چین کا سایہ بڑھ رہا ہے، اور ایک امریکی سفارتکار ہمارے صدر کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔ یہ حوالہ اس لئے دیا گیا ہے کہ آپ یہ بات سمجھ سکیں کہ جب علاقے میں بہت نازک دن تھے تو ایوب خان ہنزہ کی سیر کر رہا تھا۔ یہ ایک ایسا وقت تھا جبکہ کشمیر کو آزاد کرانے کیلئے کچھ کیا جاسکتا تھا، یہ ایک نادر موقع تھا۔ بھارت نے متنازعہ کشمیر میں سے اپنے سارے فوجی دستے نکال لئے تھے۔ پاکستان کی طرف سے کوئی بھی کارروائی کشمیر مسئلہ کو ہمیشہ کیلئے انجام تک پہنچا سکتی تھی اور ایسی کارروائی انصاف کی تصدیق ہوتی۔ عالمی رائے بھی ضرور ایسی کارروائی کے حق میں جاتی۔ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ ہمارے عظیم خچر سوار نے اس وقت کیا کہا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ "ہمیں ایسی صورت حال کا نامناسب فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے، جیسے ہم کوئی ڈاکہ ڈالنے کا منصوبہ بنا رہے ہوں۔ عالمی رائے سے خوف زدہ ہونے کا کون سا جواز موجود تھا؟ اقوام متحدہ کے پاس کہنے کیلئے کچھ بھی نہ ہوتا کیونکہ وہ بذات خود کشمیر مسئلہ حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ وہ تو ابھی تک فلسطین پر اپنی قراردادوں پر عمل درآمد نہیں کرا سکا۔

میرے دوستو! اقوام متحدہ ایک بہت بڑے فریب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک کمزور اقوام کے خلاف فریب۔ قوموں کو اپنے فیصلے خود کرنے چاہئیں، کوئی مقصد آسانی سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ مشکلات کا مقابلہ کرنا بہادر قوموں کی زندگی کا خاصہ ہے۔ وہ اپنے راستے میں آنی والی ہر رکاوٹ پر قابو پالیتی ہیں، تاہم یہ سب کچھ اس صورت میں ممکن ہے کہ جب لیڈر شپ بزدل نہ ہو۔ ہم نے ایک سنہرا موقعہ گنوا دیا، یہاں تک کہ بھارتی اخبارات نے حیرت کا اظہار کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے، میں کسی راز سے پردہ نہیں اٹھا رہا، یہ سب کچھ بھارتی اخبارات میں چھاپا جاچکا ہے۔

میرے دوستو! ۱۹۶۲ء کی جنگ کے وقت امریکہ کی پالیسی میں ایک واضح تبدیلی کو محسوس کر دیا گیا تھا۔ ہم اپنی خارجہ پالیسی میں بروقت تبدیلی لانے میں ناکام رہے۔ محمد علی بوگرہ مرحوم نے

www.bhutto.org

تھوڑی بہت کوشش ضرور کی لیکن موت نے انہیں وقت نہیں دیا۔ اس کے بعد ملکی مفادات کو سامنے رکھ کر میں نے اپنی طور پر مؤثر خارجہ پالیسی بنانے کی کوشش کی، میں جانتا تھا کہ امریکہ بھارت کو دوستی کا یقین دلانے کیلئے پاکستان پر دباؤ ڈالے گا اور وہ پاکستان کے خلاف جارحیت کرنے کیلئے بھارت کو اکسائے گا۔ امریکی پالیسی تبدیل ہو چکی تھی، میرے پاس وقت کم تھا اور حالات میرے لئے سازگار نہ تھے۔ ہمارے عظیم ڈکٹیٹر ایوب خان نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تھیں، وہ تو صورتحال میں تبدیلی کو دیکھنے کیلئے بھی تیار نہیں تھا، وہ امریکہ کے ساتھ دوستی برقرار رکھنے پر بضد تھا۔ اسے قائل کرنے میں بڑی دشواری تھی کہ وہ حقیقت کو پرکھے اور منطق کو سمجھے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ۱۹۶۵ء کے جنگ کے دوران پاکستان کو عالمی حمایت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ بھارتی وزیراعظم کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ بھارت دنیا میں اکیلا ہو گیا تھا، مصر، جس نے قاہرہ ایئرپورٹ پر وزیراعظم حسین شہید سہروردی کو اترنے نہیں دیا تھا، اس نے بھی کھلے دل سے پاکستان کی حمایت کی۔ چین، جہاں سے پہلے انڈیا کی حمایت میں نعرے بلند ہوتے تھے، اس نے بھی جنگ ستمبر کے دوران بھارت کو الٹی میٹم جاری کیا۔ روس کہ جس نے کشمیر کو کبھی بھی ایک تنازعہ تسلیم نہیں کیا تھا، اس نے بھی مسئلہ کو حل کرنے پر زور دیا۔ لاطینی امریکہ، مشرق وسطیٰ اور پورا ایشیا پاکستان کے ساتھ تھا۔ فقط ملائیشیا اور یوگوسلاویا بھارت کے ساتھ تھے۔ اس طرح کشمیر کا مسئلہ جو کہ بااثر حلقوں میں دھندلا پڑ رہا تھا، یکدم ابھر کر سامنے آیا۔ انڈونیشیا نے ہر قسم کی مدد دی اور پاکستان ایران کی جانب سے دی جانے والی مدد کو کبھی بھی بھلا نہیں سکتا۔

ہماری خارجہ پالیسی میں یہ تبدیلی میرے وزیر خارجہ بننے کے بعد آئی۔ میری حکومت سے علیحدگی کے ایک سال بعد ایوب خان نے ایران کے ساتھ تعلقات کشیدہ کر لئے۔ جب امریکہ اور برطانیہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے خلاف واپاری پابندی کی قرارداد پیش کر رہے تھے تو فرانس کے صدر ڈیگال نے یہ اعلان کیا کہ اگر یہ قرارداد پیش کی گئی تو اس کا ملک اسے ویٹو کر دیگا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ پاکستان نے سب سے پہلے ایسے ممالک کی جانب

www.bhutto.org

دوستی کا ہاتھ بڑھایا جنہوں نے بھارت کی حمایت کی تھی۔ یہاں تک کہ فرانس کا شکریہ ادا کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ بعد میں فرنچ وزیر خارجہ نے اس بارے میں شکایت کی۔ دوسری جانب صدر ایوب نے صرف برطانوی سربراہ ولسن اور امریکی صدر جانسن کو فون کیا۔ پاکستانی اخبارات میں، تاہم، یہ خبریں غلط ملط کر کے چھاپی گئیں کہ ولسن اور جانسن نے صدر ایوب کو فون کیا تھا۔ اگرچہ میں اس کا وزیر خارجہ تھا لیکن ایوب خان مجھے سلامتی کاؤنسل میں بھیجنے پر راضی نہ تھے لہٰذا میں نیویارک پہنچا تو حیرت کا اظہار کیا گیا، کیونکہ ایوب خان نے امریکی سفیر کو یہ خاطری دی تھی کہ وہ مجھے سکیورٹی کونسل میں نہیں بھیجے گا۔

میرے دوستو! اس کا سبب یہ بتایا گیا کہ میری وطن میں زیادہ ضرورت تھی، لہٰذا سلامتی کونسل میں مجھے بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔ میرے ایک نوجوان دوست سید محمد ظفر کو سکیورٹی کونسل میں بھیجا گیا لیکن اس نے وہاں سے فون کیا کہ مجھے نیویارک بھیجا جائے۔ اس نے کہا کہ حالات بہت نازک ہیں، اس وقت جنگ چل رہی تھی صرف دو دن پہلے گجرات کے وزیر اعلیٰ کی قتل کی خبریں چھپ چکیں تھیں جس کے جہاز کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ اعلان ریڈیو پر اس وقت جاری ہوا جب میں کراچی سے نیویارک کی جانب بس جانے ہی والا تھا۔ یہاں تک کہ جہاز کے پائلٹ نے اس اعلان پر اپنی پریشانی کا اظہار کیا وہ کہہ رہا تھا کہ بھارتی جہاز ہمارا گھیراؤ کر سکتے ہیں اس لئے ہم نے جہاز کا طے شدہ راستہ کو چھوڑ کر بیچ دار ہوائی راستے اختیار کئے اور جلد نیویارک پہنچنے کیلئے اڑے۔ نیویارک پہنچنے کے بعد مجھے بتایا گیا کہ مجھے تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی کیونکہ راولپنڈی سے یہ حکم صادر کیا گیا ہے۔ مجھ پر یہ فرض تھا کہ وہ فیصلہ صرف کونسل کو پڑھ کر سناؤں جو کہ جنگ بندی کے متعلق تھا۔"

اس اقتباس سے آپ اچھی طرح سے جان سکتے ہیں کہ قائد عوام نے اپنے وزارت خارجہ کے زمانے میں جو کام کیا تھا اس کے نتائج مثبت انداز میں ۱۹۶۵ء کے جنگ کے دوران سامنے آئے، جب پوری دنیا سے پاکستان کی حمایت میں آواز بلند ہوئی، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کیونکہ پاکستان کی نسبت بھارت ایک بہت بڑا ملک تھا جس کے عالمی برادری میں بہت گہرے تعلقات تھے،

www.bhutto.org

لیکن پھر بھی اس نے جنگ ستمبر کے دوران اپنے آپ کو بیگانہ محسوس کیا۔ بھارت کی یہ بیگانگی اور اکیلا پن درحقیقت شہید بھٹو کی خارجہ پالیسی کی کامیابی تھی۔ ایوب خان کی فوجی حکومت نے قائد عوام کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس میں کسی حد تک وہ کامیاب بھی ہوئی، جب ایک سال بعد بھٹو صاحب کو حکومت سے الگ ہونا پڑا۔

ہم بھٹو صاحب کی خارجہ پالیسی کی میدان میں کامیابیوں کا ذکر کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں ہمارے ماخذات ان کی تقاریر ہیں۔ ۸۔ مارچ ۱۹۷۰ء کو لاہور کے موچی گیٹ کے مقام پر ایک پبلک میٹنگ میں انہوں نے تقریر کی تھی جس میں انہوں نے اپنی خارجہ پالیسی پر روشنی ڈالی تھی:

''آپ جانتے ہیں کہ میرے وزیر خارجہ بننے سے پہلے پاکستان کی خارجہ پالیسی کتنی نقصان دہ اور غلط تھی، ہم ساری دنیا سے مکمل طور پر کٹے ہوئے تھے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی نے عوام کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھا تھا۔ ہم اپنی رضامندی سے کہیں بھی جا نہیں سکتے تھے۔ ہر ایک کام کرنے سے پہلے امریکی اجازت کی ضرورت پڑتی تھی۔ ہمارے سوویت یونین، چین، افغانستان اور ایشیا کے دوسرے ممالک اور لاطینی امریکہ اور مشرقی یورپ کے ممالک کے ساتھ تعلقات خراب تھے۔ ہماری پالیسیاں وہی تھیں جو سیٹو اور سینٹو میں بیان کردہ تھیں۔ امریکی سفیر پاکستانی پالیسی کو واشنگٹن کی پالیسی کے ساتھ کھڑا کرنے کی قوت رکھتا تھا۔ اگر وہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کیلئے سوئیز وار کے دوران کوئی خاص رخ متعین کرتا تو پاکستان اس کی فرمانبرداری کرتا تھا۔ تاہم خارجہ پالیسی اس وقت آزاد ہوئی جب میں وزیر خارجہ بنا۔ ہاں، میں یہ کہتا ہوں کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کو آزاد کرنے میں میری بہت بڑی حصہ داری ہے۔ ہمارے سوویت یونین، چین، افغانستان، مشرقی یورپ کے ممالک اور تیسری دنیا کے ساتھ تعلقات بہتر ہوئے۔ علاقائی تعاون برائے ترقی معاہدے (آر سی ڈی) کے تحت پاکستان، ایران اور ترکی ایک دوسرے کے قریب آئے۔ اس لئے، میں اگر آپ کیلئے ایک وزیر خارجہ کی حیثیت سے بیرون ملک خدمات انجام دے سکتا ہوں تو اس سے کہیں بہتر ملک میں رہ کر خدمات سرانجام دینے کے قابل ہوں۔ اگر میں آپ کے تعاون کے ساتھ

www.bhutto.org

بیرونی دنیا میں سرمایہ داروں کو شکست دے سکتا ہوں تو ہم سب ملک کر اپنے ملک میں ان سرمایہ داروں کے گماشتوں کو شکست بھی دے سکتے ہیں۔

میرے دوستو! میں ۴۲ برس کا ہو گیا ہوں اور مجھے تین چیزوں پر فخر ہے کہ میں نے ملک کو آزادانہ خارجہ پالیسی دی ہے اور میں نے اس وقت کشمیری لوگوں کی سکیورٹی کونسل میں حمایت کی تھی جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا اور دوسری بات یہ کہ میں نے آپ کے تعاون سے آمریت کو ملک میں شکست دی، تیسری بات یہ کہ میں نے ہر گلی کوچے اور شہر شہر میں جا کر اسلامی مساوات کا پیغام عام کیا۔"

بھٹو صاحب نے پاکستان کی آزادانہ خارجہ پالیسی کے خالق ہونے کی دعویٰ کرتے تھے یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں تھی، کیونکہ ان کے دشمن اور مخالف بھی اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ خارجہ پالیسی کے میدان میں انہوں نے گراں قدر کارنامے انجام دیئے تھے۔ اس سلسلے میں، میں لیفٹیننٹ جنرل (ر) جہاں داد خان کی کتاب "پاکستان: قیادت کا بحران" کے صفحہ نمبر ۱۲۶ سے یہ اقتباس پیش کرنا چاہوں گا:

"بھٹو نے پاکستان کی خارجہ پالیسی میں بڑی ذہانت اور سفارتی مہارت سے کام لیا۔ بین الاقوامی امور کے وسیع و عریض حلقوں تک ان کی رسائی تھی۔ پاکستان کے گزشتہ وزرائے خارجہ کے برعکس بھٹو صاحب نے سفارتی میدان میں نئی نئی راہیں تلاش کیں۔ ایوب خان ان کی مہارت سے بہت متاثر تھے، وہ سمجھتے تھے کہ بھٹو کی صورت میں انہیں پاکستان کے خارجہ امور کو چلانے کے لئے ایک مثالی شخص ہاتھ آ گیا ہے۔ وہ خارجہ پالیسی اور بین الاقوامی امور چلانے میں بھٹو کے فیصلوں پر پورا پورا اعتماد کرنے لگے تھے۔ بھٹو صاحب نے چین سے گہرے روابط کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ جس کے طفیل شاہراہ ریشم کی تعمیر ممکن ہوئی جو پاکستان اور چین کے درمیان خشکی کا اہم ترین راستہ ہے۔ انہوں نے اقوام متحدہ میں غیر وابستہ ممالک کی نمائندگی کی اور دیگر بین الاقوامی اداروں میں اپنی ذہانت کی دھاک بٹھا دی۔ ان کا یہ دعویٰ مبنی بر حقیقت تھا کہ انہوں نے پاکستان کیلئے ایک متوازن

www.bhutto.org

خارجہ پالیسی وضع کی اور امریکہ کی حاشیہ برادری سے نجات مل گئی۔ انہوں نے روس کے ساتھ بھی معاشی اور تجارتی تعلقات کا آغاز کیا۔ روس نے تیل اور گیس کی تلاش میں مدد دی اور بعد میں کراچی میں فولاد کا عظیم الشان کارخانہ اپنے خرچ پر تعمیر کیا۔"

جنرل صاحب قائد عوام کے جن عظیم کارناموں کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں ان کا ذکر خود بھٹو صاحب کی تحریروں میں موجود ہے۔ پاکستان اور روس کے درمیان تیل کے معاہدے کی تفصیل بھٹو صاحب کے مضمون "پاکستان اور روس کے مابین تیل کا معاہدہ" میں موجود ہے، جس میں وہ بتاتے ہیں کہ:

"اپریل ۱۹۶۰ء میں ایندھن، بجلی اور قدرتی وسائل کی الگ وزارت قائم کی گئی۔ اس وزارت کو دوسری ذمہ داریوں کے علاوہ معدنیات کی دریافت کا فریضہ بھی سونپا گیا ہے اور اس میں تیل کو اولین ترجیح حاصل ہے۔ اس وزارت نے ملک میں تیل کی صورت حال کا گہرا مطالعہ شروع کیا۔ حکومت نے ان ملکی کمپنیوں کے ساتھ جنھیں ملک میں تیل کیلئے کھدائی کے لائسنس بھی جاری کئے گئے ہیں...... ہم نے معاہدہ کو قطعی صورت راولپنڈی میں دی تھی۔ معاہدہ تیل کے تحت منجملہ اور دوسری چیزوں کے ساتھ روس پاکستان کو بارہ کروڑ روبل کا ایک قرضہ دے گا جو بارہ سال کے عرصے میں واپس کیا جائے گا۔ سوویت یونین تجربہ کار ماہرین بھی مہیا کرے گی اور قرضہ کا ۷۵ فیصد ساز و سامان کی صورت میں ہوگا جو تیل کی تلاش میں تکمیل کے بعد پاکستان کو مل جائے گا۔ معاہدہ کے تحت پاکستانی ماہرین کو بھی تربیت دی جائے گی۔"

جنرل صاحب نے بھٹو صاحب کے جس دوسرے نمایاں کارنامے کا ذکر کیا ہے جو کہ پاکستان اور چین کے درمیان سرحدی معاہدے کے بابت ہے اس کا ذکر بھی شہید بھٹو نے اپنے مضمون "پاک۔ چین سرحدی معاہدہ" میں کچھ اس طرح سے کیا ہے:

"پاک چین سرحدی معاہدہ چینی علاقے سنکیانگ اور اس سے ملحقہ علاقوں (جن کا تحفظ پاکستان کی ذمہ داری ہے) کے درمیان موجودہ سرحدوں کا تعین اور نشاندہی کی متفقہ مفاہمت پر

www.bhutto.org

مشتمل ہے اور معاہدے میں متعلقہ علاقے کی براہ راست یا بالواسطہ تقسیم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ معاہدے کا مقصد ایشیا کے اس حساس ترین علاقے کے امن و امان کی ضمانت دینا اور اس طرح عالمی امن و سلامتی کو مستحکم کرنا ہے۔"

اس کے بعد ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء کو ایبٹ آباد میں شہید بھٹو کے عام جلسے کو کئے گئے خطاب سے اقتباس دینا چاہوں گا جو کہ خارجہ پالیسی کے بارے میں ہے:

"ہم نے ان ممالک سے اچھے تعلقات استوار کئے جن کو ہم نظر انداز کرتے آئے تھے۔ افغانستان کے ساتھ ہمارے تعلقات میں بڑا کھچاؤ تھا۔ سوویت یونین کے ساتھ ہمارے اچھے تعلقات نہیں تھے، اور چین کے ساتھ بھی ہمارے قائم کردہ تعلقات کو بہتر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جب میں قدرتی وسائل کے وزیر کی حیثیت سے روس گیا تو وہاں پر ایک معاہدہ طے کر آیا جس کے بعد اس دور کی ایک بڑی طاقت سے ہمارے بہتر تعلقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب ہم نے بھارت کے خلاف جنگ لڑی تو الجیریا سے لیکر اردن تک ممالک نے پاکستان کی حمایت کی۔ اس وقت تک ہمارے ہاں اسلامی سیکریٹریٹ کا وجود نہیں تھا۔ موجودہ زمانہ میں جب اسلامی سیکریٹریٹ کے قیام کا سوال پیدا ہوا تو بہت سارے عرب ممالک نے اس سلسلے میں عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے انکار کر دیا۔ جنگ کے دوران شاستری نے خود یہ کہا کہ بھارت اکیلا ہو چکا ہے۔ یہ سب تبدیلیاں اس وقت عمل میں آئیں جب میں وزیر خارجہ بنا۔ میری خارجہ پالیسی عوام کی خارجہ پالیسی تھی۔ بھارت کے ساتھ جنگ کے دوران میں نے سلامتی کونسل میں خطاب کیا اور عزم کے ساتھ یہ بات دہرائی کہ ہم بھارت کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہیں گے، جس کے بعد بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ سکیورٹی کونسل چھوڑ گئے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ ہم بھارت سے خوف زدہ نہیں ہیں کیونکہ کے ہم ایک مقصد کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ ایوب خان بھارت سے ڈرتا تھا۔ اس کے پاس ایک نقشہ ہوا کرتا تھا جو دکھا کر وہ کہتا تھا کہ بھارت کی سائیز کو دیکھو، وہ یہ بتایا کرتا تھا کہ بھارت ایک بہت بڑا ملک ہے جس کی بہت بڑی آبادی ہے اور اس کے پاس بے پناہ وسائل ہیں۔ میں اس سے کہا کرتا تھا کہ ایوب خان صاحب برائے

www.bhutto.org

مہربانی یہ نقشہ سمیٹ لیں ہم بھارت سے لڑیں گے۔"

اس اقتباس کے ساتھ میں ایک اور تقریر کا اقتباس پیش کرنا چاہوں گا جو کہ ۲۴ مئی ۱۹۷۰ء کو ٹیکسلا میں کی گئی تھی۔ یہ اقتباس اوپر دیئے گئے حوالے کا ایک تسلسل ہے:

"میں نے پہلا وعدہ یہ کیا تھا کہ ملک کو ایک آزادانہ خارجہ پالیسی دوں گا، آپ نے دیکھا کہ بہت ساری مشکلاتوں کے بعد بھی میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس سے پہلے ہماری خارجہ پالیسی پر ایک بڑی طاقت کا غلبہ تھا ہم ہر ایک کام اس کی مرضی سے کرتے تھے۔ ہم ساری دنیا کی حمایت اور ہمدردی سے محروم ہو چکے تھے۔ میں نے روسیوں کے ساتھ معاہدہ کرنے کیلئے پیشقدمی کی اس کیلئے مجھے ایوب خان کے وزیر مالیات اور امریکہ دونوں سے جنگ لڑنی پڑی لیکن میں کامیاب رہا۔ میں چین گیا اور اس بڑی طاقت کے ساتھ سرحدی سوال کا حل تلاش کیا۔ یہاں سے چین کے ساتھ تعلقات کا ایک نیا باب کھلا۔ میں نے افغانستان اور عرب ممالک کے ساتھ تعلقات بہتر بنائے۔ انڈونیشیا کے ساتھ تعلقات میں تبدیلی لائی گئی۔ پہلے ہم ساری دنیا میں اکیلے تھے لیکن اب ہر ایک حکومت جو کہ اقتدار پر آتی ہے تو فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی کامیاب ہے۔ اس خارجہ پالیسی کی بنیادیں اس وقت ڈالیں گئیں جب میں وزیر خارجہ بنا۔"

ان اقتباسات سے آپ بھٹو صاحب کی خارجہ پالیسی کے میدان میں حاصل کی گئیں کامیابیوں کا اچھے طریقے سے احاطہ کر سکتے ہیں اور اس کے ساتھ آپ کو شاید یہ تشنگی محسوس ہو رہی ہو کہ آخر افغانستان کے ساتھ کیا معاملات طے پائے تھے یا پا رہے تھے کہ جن کا ذکر بھٹو صاحب کی تقاریر میں بار بار آیا ہے، اس سلسلے میں ہمیں قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کے اس تفصیلی اور یادگار خط سے رجوع کرنا پڑتا ہے جو کہ انہوں نے پھانسی کی کال کوٹھری سے اپنی پیاری بیٹی محترمہ بینظیر بھٹو کو لکھا تھا، انہوں نے اس خط میں یہ تفصیل اس طرح سے بیان کی ہے:

"افغانستان کے صدر محمد داؤد ان واقعات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں نے بلوچستان اور صوبہ سرحد میں صورت حال کو مؤثر طور پر کنٹرول کر لیا ہے۔ جب انہیں یقین

www.bhutto.org

ہو گیا کہ میں نے بحران پر قابو پالیا ہے تو ایک حقیقت پسند شخص کی طرح انہوں نے مجھے کابل مدعو کیا تاکہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان سیاسی اختلافات کو طے کیا جا سکے۔ وہ دوسرے متبادل طریقے آزما چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں نے نہ صرف داخلی بحران پر قابو حاصل کر لیا ہے بلکہ مداخلت کو بھی غیر مؤثر بنا دیا ہے۔ جس میں امکانی امداد اور اصل امداد دونوں ہی شامل تھیں۔ پانسہ پھینکا جا چکا تھا۔ میں نے خلوصِ دل سے بات چیت کے لئے ان کی دعوت پر لبیک کہا۔ جب جون ۱۹۷۶ء کے پہلے ہفتہ میں، میں نے افغانستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو صدر افغانستان نے میرا خوش دلی اور مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے تین سال پہلے اپنی پہلی ہی تقریر میں پاکستان کو دھمکیاں دی تھیں جب وہ ایک فوجی انقلاب کے ذریعے برسر اقتدار آیا تھا۔ کابل میں بات چیت دوستانہ ماحول میں ہوئی۔ صدر داؤد چاہتے تھے کہ میں نیپ کے لیڈروں کو خیر سگالی کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے رہا کر دوں۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ جب خیر سگالی کا خوشگوار اثر ہو گا تو افغانستان متنازعہ ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کر لے گا۔ ان وجوہات کی بنیاد پر جن کے تذکرہ کی اس خط میں ضرورت نہیں ہے، میں نے افغانستان کے صدر سے کہا کہ دونوں خیر سگالی کے جذبات پر ایک ساتھ ایک معاہدہ کی شکل میں عمل ہو گا۔ میں نے ان سے کہا کہ انصاف کا توازن، لینے اور دینے کے معاہدہ میں ہے جو ایک ہی وقت ہو۔ میں نے نیپ کے لیڈروں کو رہا کرنے کا وعدہ کیا اور ان کے خلاف الزامات واپس لینے کو کہا جس کے بدلہ میں انہیں ساتھ ہی ساتھ ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ ہم نے اگست ۱۹۷۶ء میں پاکستان میں مذاکرات جاری رکھنے سے اتفاق رائے کیا۔ میرے کابل سے روانہ ہونے سے قبل ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا۔ اس اعلامیہ میں کہا گیا تھا کہ دونوں ممالک اپنے سیاسی اختلافات کو پر امن بقائے باہمی کے پانچ اصولوں کی بنیاد پر طے کریں گے۔

جب داؤد اگست ۱۹۷۶ء میں پاکستان آئے تو یہ طے ہو گیا کہ دونوں جانب سے اکٹھا معاہدہ ہو گا جس پر ایک ساتھ عمل کیا جائے گا۔ حکومت پاکستان نیپ کے لیڈروں کو رہا کر دے گی۔ اور ان کے خلاف غداری کے الزامات واپس لے لے گی اور افغانستان کی حکومت موجودہ سرحد (

www.bhutto.org

ڈیورنڈ لائن) کو تسلیم کر لے گی۔ افغانستان اور پاکستان کے دفاتر خارجہ کے حکام نے اپنے اپنے وزراء کی قیادت میں "پیکج فارمولہ" کی تفصیلات لاہور میں اگست ۱۹۷۶ء میں بذریعہ تحریر طے کیں۔ طرفین نے اس امر سے اتفاق کیا کہ میں اکتوبر/نومبر ۱۹۷۶ء میں کابل کا دورہ کروں گا اور افغانستان کے صدر کے ساتھ باضابطہ معاہدہ، معاہدہ کے مسودہ کی شرائط کے مطابق کروں گا۔ دیر میں جو گڑبڑ ہوئی خواہ وہ کسی سازش کے تحت ہوئی یا نہیں اس کے باعث میں نومبر ۱۹۷۶ء میں کابل نہیں جا سکا۔ پھر ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو نواب شاہ میں میرے اور پاکستان میں متعین افغان سفیر مسٹر نور احمد اعتمادی کے درمیان یہ طے ہوا کے میں مارچ ۱۹۷۷ء کے آخر میں کابل جاؤں گا اور ایسا پاکستان میں انتخابات کے ایک یا دو ہفتے بعد کروں گا..... جولائی ۱۹۷۷ء کے فوجی انقلاب کے بعد جنرل ضیاء الحق نے کابل کا دورہ کیا اور صدر داؤد سے ملاقات کی۔ کابل سے واپسی کے فوراً بعد انہوں نے نیپ کے لیڈروں کو حیدرآباد جیل سے رہا کر دیا۔ مستقبل قریب میں وقت بتائے گا کہ آیا ایسا غیر مشروط طور پر کیا گیا یا مسئلے کے حل سے قبل مفاہمت یا سمجھوتہ کی یقین دہانی پر کیا گیا۔ مارچ ۱۹۷۸ء میں صدر داؤد نے پاکستان کا دورہ کیا۔ خوش کن تقاریر ہوئیں۔ تاہم ایک تقریر میں صدر داؤد نے خاص طور پر کہا کہ سیاسی مسئلے ابھی حل ہونا باقی ہیں۔ کوئی مشترکہ اعلامیہ جاری نہیں کیا گیا، جب سردار داؤد نے پاکستان کا دورہ کیا۔ اگر تیس سال کے تعطل اور ہیجان کے بعد جس میں کبھی کبھی تو بہت زیادہ اضافہ بھی ہوا، میں جون ۱۹۷۶ء میں کابل میں کابل حکومت سے مشترکہ اعلامیہ جاری کرا سکا جو پُر امن بقائے باہمی کے پانچ اصولوں پر مبنی سیاسی اختلافات کو طے کرنے کے بارے میں تھا تو پھر یہ ایک معمہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق کیوں کابل یا اسلام آباد میں ایک مشترکہ اعلامیہ کے ذریعہ اس کی تصدیق و توثیق نہیں کرا سکے۔ اگر کوئی زیادہ اہم خفیہ معاہدہ ان کے درمیان ہوا تھا تب بھی جون ۱۹۷۶ء کے کابل اعلامیہ کا ادعا پاکستان اور افغانستان کے عوام کے فائدہ کیلئے اور زیادہ ضروری تھا۔"

یہاں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ پاک افغان تعلقات میں جو بہتری آئی تھی اور ان کے اختلافات "کچھ دو اور کچھ لو" کے اصول کے تحت ختم ہو رہے تھے اور ایک مسودہ بھی تیار کیا گیا

www.bhutto.org

تھا جس پر دونوں ملکوں کے سربراہان کے دستخط ہونا باقی تھے، عین اس وقت ایک دانستہ سازش کے تحت قائد عوام کو اقتدار سے الگ کیا گیا تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد سردار دؤد کی خواہش پر نیپ لیڈران کو تو رہا کر دیا لیکن ڈیورنڈ لائن کا مسئلہ جوں کا توں رہا، اگر جنرل ضیاء الحق نے تھوڑی بھی سمجھداری سے کام لیا ہوتا تو یہ معاملہ اسی وقت ختم ہو چکا ہوتا لیکن اس غلطی کی وجہ سے پاک افغان تعلقات میں ابھی تک تلخی اور کشیدگی موجود ہے جس کی بنیاد ڈیورنڈ لائن ہے۔ آج بھی افغانستان پاکستان کے علاقوں پر اپنی دعویٰ کر رہا ہے۔

سب سے آخر میں قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کی اس تقریر کا مکمل متن پیش کیا جاتا ہے جو کہ انہوں نے ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کو سلامتی کونسل (نیویارک) میں کی تھی جب معاہدہ تاشقند اور اقوام متحدہ کے چارٹر کی انحرافی کرتے ہوئے بھارت نے مشرقی پاکستان میں جارحیت کا مظاہرہ کیا تھا اور پاکستانی افواج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا تھا۔ تقریر کا متن پیش کیا جاتا ہے:

''ہم آج یہاں میرے ملک کی تاریخ کے ایک نازک موڑ پر جمع ہوئے ہیں۔ میں کونسل سے درخواست کروں گا کہ وہ برائے مہربانی مجھے برداشت کریں اور سچائی سنیں، تلخ سچائی۔ میں اقوام متحدہ کو جانتا ہوں میں سلامتی کونسل کو بھی جانتا ہوں۔ میں نے پہلے بھی ان کے اجلاس میں شرکت کی ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں سچ بولنا پڑیگا چاہے کونسل کے اراکین اسے پسند کریں یا نہ کریں۔ ہم اُمید کر رہے تھے کہ سلامتی کونسل دنیا میں امن اور انصاف برقرار رکھنے کیلئے اپنی ذمہ داریوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اصولوں کے مطابق میرے عوام کے خلاف عریاں اور ظالمانہ جارحیت کو ختم کرائے گی۔ میں اسی مقصد کیلئے یہاں آیا تھا۔ اس وقت پاکستانی عوام کو میری ضرورت تھی۔ جب میں پاکستان سے روانہ ہوا تو میں اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ کہ مجھے سلامتی کونسل میں جانا چاہیے جہاں میں اپنے ملک کا موقف پیش کروں، اپنے عوام کا موقف پیش کروں جنھیں جارحیت کا نشانہ بنایا گیا ہے یا مجھے اپنے عوام کے ساتھ ان کے پہلو بہ پہلو رہنا چاہیے۔ جبکہ وہ حملے اور تشدد کا شکار ہو رہے تھے۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ میرا یہاں آنا ضروری

www.bhutto.org

ہے تا کہ میں سلامتی کونسل سے انصاف طلب کر سکوں۔ اراکین کو یہ بات پسند ہو یا نہ ہو لیکن میں ضرور کہوں گا کہ سلامتی کونسل نے میرے ملک کو انصاف سے محروم کیا ہے۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں ہمیں تاخیری حربوں میں الجھایا جا رہا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا جب بھارت کے وزیر خارجہ نے تقریر کی اور اس کے بعد میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ تاخیری حربے استعمال ہو رہے ہیں، وہ میرا فوری مشاہدہ تھا۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ سلامتی کونسل کو نہ صرف مواد بلکہ طریق کار میں بھی تاخیری حربوں کے فن میں کمال حاصل ہے۔ قدرے بیزاری سے میں نے کل سلامتی کونسل کا پورا ایک گھنٹہ اس سبب سے برباد ہوتے دیکھا کہ آیا کونسل کے اراکین ۹/۳۰ بجے صبح ملنے پر رضامند ہوں گے یا ان کے آرام و طعام کا تقاضہ ہے کہ وہ صبح ۱۱ بجے ملیں۔

صومالیہ کے نمائندے نے مشرقی پاکستان کی آبادی کا حوالہ دیتے ہوئے اسے پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ بتایا بلکہ بعد میں انہوں نے تصحیح کرتے ہوئے مسلم بنگال کی آبادی کو سات کروڑ سات لاکھ قرار دیا۔ اگر وہ کچھ دن اور ٹھہر جاتے تو انہیں تصحیح کرنے کی بھی ضرورت پیش نہ آتی۔ کیونکہ لاکھوں لوگ مر رہے ہیں۔ اگر کونسل اسی طرح تاخیری حربے استعمال کرتی رہتی اور یہ سوچتی رہتی کہ آیا اسے آج ملنا چاہیے یا کل یا پرسوں یا پھر نیویارک، ماسکو، پیکنگ اور دوسرے دارالحکومتوں کا مواصلاتی رابطہ اراکین کو نئی ہدایات حاصل کرنے کی اجازت دے گا یا نہیں، تو یہ آبادی پانچ کروڑ سات لاکھ ہی رہ جاتی اور بحث کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہونے پاتا۔ جناب صدر، اسی وجہ سے میں نے آپ سے درخواست کی کہ سلامتی کونسل کا فوری اجلاس بلایا جائے۔ اور میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے یہ اجلاس طلب کیا۔ کیونکہ قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ میرے لوگ، میرے عوام مر رہے ہیں۔ اسی لئے میں سوچتا ہوں کہ اگر میں اب اس سلسلے پر بات کروں تو میں آپ کی کاوشوں میں آپ کا ہاتھ بٹا سکتا ہوں۔ سلامتی کونسل میں شاید یہ میری آخری تقریر ہوگی۔ لہٰذا برائے مہربانی برداشت کیا جائے۔ کیونکہ میرے پاس کچھ اندرونی صداقتیں ہیں جو میں سلامتی کونسل کو بتانا چاہتا ہوں۔ دنیا کو جاننا

www.bhutto.org

چاہیے، میرے عوام کو جاننا چاہیے۔ میں یہاں ہتھیار ڈالنے نہیں آیا۔ اگر سلامتی کونسل مجھے اس دستبرداری کو قانونی حیثیت دینے کے معاملہ میں حصہ دار بنانا چاہتی ہے، تو میں کہتا ہوں کہ ایسا کسی صورت میں نہیں ہوگا۔ کل میرے گیارہ سالہ بیٹے نے کراچی سے فون کیا اور کہا کہ ''دستبرداری کی دستاویز کے ساتھ واپس مت آئیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو ہم آپ کو واپس پاکستان میں نہیں دیکھنا چاہتے''۔ لہٰذا میں سلامتی کونسل سے دستبرداری کی دستاویز لے کر واپس نہیں جاؤں گا۔ نہ ہی جارحیت کو قانونی جواز مہیا کرنے میں فریق بنوں گا۔

سلامتی کونسل بری طرح اور شرمناک ناکامی سے دوچار ہوئی ہے۔ ''اقوام متحدہ کا دستور''، ''سان فرانسسکو کانفرنس''، ''عالمی امن اور انصاف'' یہ وہ اصطلاحات ہیں جو ہم نے اپنی جوانی میں سنی تھیں اور ہم اقوام متحدہ کے عالمی امن، انصاف اور سلامتی کے تصور سے متاثر ہوئے تھے۔ صدر روزولسن نے کہا تھا کہ میں نے پہلی جنگ عظیم اس لئے لڑی تاکہ جنگیں ہمیشہ کیلئے ختم ہوں۔ پھر جمعیت اقوام عمل میں آئی اور اس کے بعد اقوام متحدہ۔ اقوام متحدہ نے کیا کیا۔ میں اقوام متحدہ کا ڈھونگ اور فریب جانتا ہوں، وہ آتے ہیں اور کہتے ہیں ''ایکسیلنس، ایکسیلنس'' ایک بہت اچھی تقریر۔ آپ نے بہت اچھی تقریر کی ہے۔

ہم نے یہ سب باتیں سنی ہیں۔ اقوام متحدہ ان فیشن گھروں کی مانند ہے جو مصنوعی مجسموں کو خوشنما لباس میں پیش کر کے بدصورت حقیقتوں کو چھپا دیتے ہیں۔ حقیقتوں کا چھپانا دونوں صورتوں میں ایک عام بات ہے لیکن بدصورت حقیقتوں کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ آپ کو ایک سیکریٹری جنرل کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو ایک بڑے جلاد کی ضرورت ہے۔

آیئے اس کھلی حقیقت کا سامنا کریں۔ اس لمحے داؤ پر لگانے کیلئے میرے پاس کچھ نہیں بچا۔ اس لئے میں اپنے دل سے سچ بول رہا ہوں۔ ہم یہاں چار دن سے خورد و خوض کر رہے ہیں۔ چار دن سے سلامتی کونسل تاخیری حربے استعمال کر رہی ہے۔ کیوں؟ کیونکہ اس کا مقصد سقوط ڈھاکہ تھا، یہی مقصد تھا۔ مجھے شروع سے ہی اس کا اندازہ تھا۔ ٹھیک ہے۔ اگر سقوط ڈھاکہ ہوا تو کیا ہوا؟ شہر اور

www.bhutto.org

ممالک اس سے پہلے بھی ٹوٹتے رہے۔ وہ غیر ملکی تسلط میں آئے۔ چین کئی سال تک غیر ملکی تسلط میں رہا دوسرے ملک بھی غیر ملکی تسلط میں رہے۔ فرانس بھی غیر ملکی تسلط میں رہا۔ مغربی یورپ بھی غیر ملکی تسلط میں رہا۔ تو کیا ہوا کہ سقوط ڈھاکہ ہوا۔ اور اگر پورا مشرقی پاکستان الگ ہو جائے تو کیا ہو جائے گا۔ اگر مغربی پاکستان الگ ہو جائے تو کیا ہو جائے گا۔ اگر ہماری مملکت کی صورت بگاڑ دی جائے، ہم ایک نیا پاکستان بنائیں گے۔ ہم ایک بہتر پاکستان بنائیں گے، ہم ایک عظیم تر پاکستان تعمیر کریں گے۔

سلامتی کونسل نے ناعاقبت اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان تاخیری حربوں پر خاموشی اختیار کی ہے۔ اور اس مقام تک آ گئے کہ ہم مجبور ہو کر یہ کہہ دیں "آپ جو چاہیں کر لیں"۔ اگر اس مقام تک پہنچتے تو ہم کوئی معاہدہ کر چکے ہوتے۔ ہم نے کہا ہوتا "ٹھیک ہے ہم کچھ کرنے کیلئے تیار ہیں" اب ہم ایسا کیوں کریں۔ آپ ہمیں بندوق کی نوک پر خاموش کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کیوں کہیں کہ ہم کسی بھی چیز کیلئے رضامند ہیں۔ اب آپ جو چاہیں فیصلہ کریں، ہم آپ کے فیصلہ کے پابند نہیں ہوں گے۔ آپ کو جو پسند ہو وہ فیصلہ کر لیں۔ اگر آپ نے ہمارے لئے امید کی کوئی کرن چھوڑی ہوتی تو ہم کسی فیصلے میں حصہ دار بن سکتے تھے۔

لیکن بھارتی بہت ناعاقبت اندیش ہیں۔ جناب صدر آپ نے بھارتی وزیر خارجہ کا حوالہ دیتے ہوئے انہیں "ممتاز" کہا ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ جارحیت کی جس پالیسی کو درست قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں، اس میں ایسی کیا "ممتاز" بات ہے۔ وہ کیسے "ممتاز" ہیں جبکہ ان کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ جبکہ ان کا دل زہر آلود ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ بصیرت سے محروم ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا کیونکہ ان میں بصیرت کی کمی ہے۔ وہ اپنی قدیم تہذیب اور ہندوستان کی قدیم روایات اور اس طرح کی کئی باتیں کرتے ہیں لیکن ان میں بصیرت کا فقدان ہے۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو مختلف طریقے سے عمل کرتا۔ اگلے روز میں نے ان کی طرف

www.bhutto.org

دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو ان کو جاننا چاہیے تھا کہ میرا کیا مقصد ہے۔ میں کسی کٹھ پتلی کی طرح بات نہیں کر رہا۔ میں مغربی پاکستان کے عوام کے ایک مستند رہنما کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں جنہوں نے مجھے انتخاب میں اس متاثر کن کامیابی سے ہمکنار کیا جو مجیب الرحمان کو مشرقی پاکستان میں حاصل ہونے والی کامیابی سے کہیں زیادہ تھی اور اسے اس بات کو تسلیم کر لینا چاہیے تھا لیکن اس نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ ہم اپنے تعلقات میں ایک نیا صفحہ، ایک نیا باب کھول سکتے تھے۔

جیسے کہ میں نے کہا، فرانس اور جرمنی میں تعلقات استوار ہو سکتے ہیں تو ہندوستان اور پاکستان اس طرح کیوں نہیں کر سکتے۔ اگر ترک اور یونانی مہذب لوگوں کی طرح قبرص پر دانشمندانہ بات کر سکتے ہیں تو ہندوستان اور پاکستان کیوں نہیں کر سکتے۔ اگر سوویت یونین اور امریکہ تاریخ کا ایک نیا باب کھول سکتے ہیں، اگر چین اور امریکہ اپنی تاریخ کا نیا باب شروع کر سکتے ہیں تو ہم اپنے تعلقات میں ایک نئے دور کا آغاز کیوں نہیں کر سکتے۔ ہم ایسا کر سکتے تھے لیکن جیسا کہ کہا گیا کہ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کی عسکری فتح نے اسرائیل اور عربوں میں مفاہمت کیلئے اور زیادہ مشکل پیدا کر دی۔ اگر آپ پاکستان کو فوجی قوت سے زیر کرنا چاہتے ہیں تو آپ کیلئے امن قائم کرنا زیادہ مشکل ہوگا۔ میں کہتا ہوں اب ہمیں انتخاب کرنا ہے کہ یا تو ہم اسی برصغیر میں ایک ساتھ رہنا منظور کریں اور امن اور ترقی کیلئے تعاون کریں یا پھر ہم ہمیشہ کیلئے ایک دوسرے کے سخت دشمن بنے رہیں۔

سوویت یونین کے مستقل نمائندے کو میرا رومن سلطنت کا حوالہ پسند نہیں آیا۔ مجھے علم نہیں کہ انہیں اس پر کیا اعتراض ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی سلطنت اور رومن سلطنت کے درمیان مماثلت پاتے ہوں، مجھے واقعی سمجھ نہیں آتا کہ ان کو اس پر کیوں کوئی اعتراض تھا۔ لیکن میں ایک بار پھر رومن سلطنت کا حوالہ دوں گا۔ اور مجھے امید ہے کہ سوویت یونین کے مستقل نمائندے کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم سوویت یونین کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں۔ اور سوویت یونین کے ساتھ ہم ایک نئے باب کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہم پڑوسی ہیں۔ میں پھر

www.bhutto.org

سلطنت روم کا ذکر کرتا ہوں اور وہی کہتا ہوں جو کیٹو (Kato) نے رومنوں سے کہا تھا" کارتھیج (Carthage) کو تباہ کر دیا جائے۔" اگر بھارت سمجھتا ہے کہ وہ پاکستان کو زیر کرنے جا رہا ہے، مشرقی اور مغربی پاکستان کو کیونکہ ہم ایک قوم ہیں ہم ایک مملکت ہیں تو پھر ہم یہی کہیں گے،" کارتھیج کو تباہ کر دیا جائے" پھر ہم اپنے بچوں سے کہیں گے اور وہ اپنے بچوں سے کہیں گے کہ کارتھیج کو تباہ کر دیا جائے۔

جناب صدر اور ارکان سلامتی کونسل حالات کی پیچیدگی کا احساس کریں۔ پاکستانی قوم ایک بہادر قوم ہے۔ برطانیہ کے ایک عظیم رہنما نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ پاکستانی پیادہ جوان دنیا کی بہترین فوج ہیں۔ ہم لڑیں گے اگر ضرورت پڑی تو ہم ایک ہزار سال تک لڑیں گے، لہٰذا وقتی فوجی فتوحات پر نہ جائیں۔ سٹالن گراڈ کو کچل دیا گیا تھا۔ لینن گراڈ کو ایک ہزار دنوں تک محاصرے میں رکھا گیا۔ جو لوگ آزادی چاہتے ہیں اور جو اپنے تشخص کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں وہ اپنے اصولوں کیلئے لڑیں گے اور لڑتے رہیں گے۔

ہمیں حقیقتوں کی باتیں سنائی گئیں اور حقیقتوں کو قبول کرنے کے بارے میں کہا گیا۔ حقیقتیں کیا ہیں، حقیقتیں بدلتی رہتی ہیں۔ سوویت یونین کے مستقل نمائندے جانتے ہیں کہ ایک زمانے میں حقیقت یہ بھی تھی کہ نازی فوج ماسکو کے دروازوں پر کھڑی تھی۔ لیکن آپ نے بہادری اور شجاعت سے مقابلہ کیا اور دنیا نے روس کو ان حقیقتوں کی مزاحمت کرنے پر سلام پیش کیا جو اس پر ٹھونسی جا رہی تھیں۔ حقیقت یہ بھی تھی کہ چین، جاپان کے تسلط میں تھا، منچوریا (Manchuria) جو کہ آدھا چین ہے، لے لیا گیا تھا، یہ بھی حقیقت ہے کہ انڈونیشیا کے خلاف جنگ کے وقت چین نے حقیقت کو دیکھا۔ فرانس کی حقیقت یہ تھی کہ وہ زیر تسلط تھا لیکن کچھ عظیم لوگ جیسے صدر ڈیگال فرانس سے چلے گئے اور سمندروں کے پار سے لڑتے رہے۔ ایتھوپیا، فسطائی تسلط میں تھا۔ لیکن ایتھوپیا کے لوگ لڑے۔ ایتھوپیا کے بادشاہ نے ملک چھوڑ دیا اور برطانیہ میں سیاسی پناہ حاصل کی۔ ایتھوپیا آج آزاد ہے۔ اہمیت کی حامل حقیقتیں وہ ہیں جو عارضی نوعیت کی نہیں ہوتیں جن کی جڑیں تاریخی اصولوں میں پیوست

www.bhutto.org

ہوتی ہیں۔ اصول یہ ہے کہ پاکستان ایک آزاد اور خود مختیار ریاست ہے جس کا وجود یہاں کے عوام کی قوتِ ارادی سے عمل میں آیا۔ یہ وہ بنیادی حقیقت ہے جو کہ ۲۴ برس سے قائم ہے۔ اگر ایک دوسرے ملک نے حملہ نہ کیا ہوتا تو پاکستان کبھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہوتا، یہ کوئی اندرونی تحریک نہیں ہے۔ ہم پر فوجی لحاظ سے طاقتور پڑوسی حملہ آور ہوا ہے۔ جو کہتا ہے کہ یہ نئی حقیقت لوگوں کی مرضی سے وجود میں آئی، اگر لوگوں کی آزادانہ رائے کا لحاظ رکھا جاتا تو بھارت پاکستان پر حملہ نہ کرتا۔ اگر بھارت مشرقی پاکستان کے عوام کی رائے کی بات کر رہا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس نے پاکستان پر حملہ مشرقی پاکستان کے عوام کی رائے برقرار رکھنے کیلئے کیا ہے تو اس نے کشمیر میں کیا کیا۔ مشرقی پاکستان تو مغربی پاکستان کا اٹوٹ انگ ہی۔ جبکہ کشمیر ایک متنازع علاقہ ہے۔ تو پھر بھارت کشمیر کے عوام کو رائے دہی کی اجازت کیوں نہیں دیتا۔

کل میں نے دیکھا کہ کس طرح سلامتی کونسل بھارت کو شہہ دے رہی تھی۔ یہاں تک کہ عظیم طاقتیں بھی ہمیں یہ کہتے ہوئے بھارت کو شہہ دے رہی تھیں کہ "ہماری بات کا غلط مطلب نہ لیں" کیا آپ ہمیں بتائیں گے اور کیا آپ ان سوالوں کے جواب دیں گے۔ میں ان سوالات پر اصرار نہیں کر رہا۔ لیکن اگر آپ محسوس نہ کریں" وغیرہ۔ بھارت آج اپنی فوجی فتوحات کے نشے میں چور ہے۔

میں نے بھارت کے مستقل مندوب پر ۱۹۶۷ء میں واضح کیا تھا کہ ہم دونوں ملکوں کے درمیان اچھے تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ تعلقات اصولوں، انصاف اور برابری پر مبنی ہوں نہ کہ استحصال اور تسلط پر مبنی ہوں۔ کیونکہ ایسے تعلقات دیرپا نہیں ہوتے۔ ہم ایک دیرپا حل چاہتے ہیں۔ ایک مستقل حل۔ میں یہ بات صرف آج نہیں کہہ رہا میں نے ۱۹۶۷ء میں بھارت کے مستقل نمائندے سے بھی کہا تھا جو اس وقت پاکستان میں بھارت کے ہائے کمشنر تھے۔ جب ہم کشمیر کے معاملہ پر گفتگو کر رہے تھے تو میں نے بھارتی وزیر خارجہ سے بھی کہا تھا کہ ہمیں اس مسئلے کو برابری اور انصاف کی بنیاد پر حل کرنا چاہیے، تاکہ ہم اچھے پڑوسیوں کی طرح رہ سکیں اور آج میں پھر کہوں گا کہ ہم

www.bhutto.org

اچھے پڑوسی کی طرح رہ سکتے ہیں اور اس امکان کو فوجی فتح اور فوجی طاقت کے ذریعے ختم نہ کیا جائے۔

یہ جارحیت کی ننگی جارحیت کی بدترین قسم ہے۔ اس طرح تو جرمنوں نے بھی پولینڈ پر حملہ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس معاملے میں اُن کے پاس پیش کرنے کیلئے کوئی جواز اور بہانہ موجود تھا۔ یہاں پر بہانہ یہ بنایا گیا ''ہمارے پاس مہاجرین ہیں۔ لہٰذا ہمیں دوسرے ملک پر حملہ ضرور کرنا چاہیے۔'' ہم نے کہا ''ہم اُن مہاجرین کو واپس لینے کیلئے تیار ہیں'' اگر ہم یہ کہتے ''ہم انھیں واپس لینے کیلئے تیار نہیں۔'' تو پھر آپ یہ کہتے کہ ''آپ غرق ہو جائیں گے''۔ ہندوستان کی آبادی ہر سال ۱۰ کروڑ ۳۰ لاکھ کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ مہاجرین کی تعداد ایک کروڑ تک بتائی گئی تھی۔ ہمارے اندازے کے مطابق ان کی تعداد پچاس لاکھ تھی۔ لیکن یہ اہم نہیں ہے۔ اعداد و شمار اہم نہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ ہم انہیں واپس لینے کو تیار تھے۔ اگر بھارت کی آبادی ایک لاکھ تیس ہزار سالانہ کے حساب سے بڑھتی ہے تو اس تمام امداد سے جو بھارت مہاجرین کے نام پر حاصل کر رہا تھا، وہ یہ مختصر عرصہ گزار سکتا تھا اس عرصہ میں پاکستان میں ایک عوامی حکومت وجود میں آ جاتی جو مہاجرین کی واپسی پر بات چیت کرتی۔ میں نے پاکستان میں امریکہ کے سفیر کو ایک مرتبہ بتایا تھا کہ جب پاکستان میں عوامی حکومت برسر اقتدار ہو گی تو میں ذاتی طور پر مہاجر کیمپوں میں جانے کیلئے تیار ہوں، تاکہ اُن سے بات کر سکوں۔ لیکن بھارت نے پہلے ہی قبضہ کر لیا کیونکہ انہوں نے مہاجرین کا مسئلہ میرے ملک کو ٹکڑے کرنے کے بہانے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ مہاجرین کا مسئلہ ایک بہانے کے طور پر استعمال کیا گیا، ایک بدصورت، مذموم بہانہ، ایک شرمناک بہانہ تاکہ میرے ملک پر حملہ کیا جا سکے، تاکہ مشرقی پاکستان پر حملہ کیا جا سکے۔

بڑی طاقتیں مجھے معاف کریں کہ میں نے انہیں دکھ کی اس گھڑی میں مخاطب کیا ہے اور انہیں میری اس کیفیت کو سمجھنا چاہیے۔ بڑی طاقتوں یا عظیم طاقتوں یا اس سے بھی عظیم طاقتوں نے اور چکا چوند کر دینے والی بڑی طاقتوں نے اپنی مرضی کو اس لمحے مسلط کر دیا ہے۔ لیکن میں عظیم طاقتوں میں سے امریکہ کے عوام اور حکومت کا اس موقف کیلئے شکر گزار ہوں جو انہوں نے اختیار کیا ہے۔ امریکہ

www.bhutto.org

کے عوام کو کسی حد تک بھارت کے زبردست پراپیگنڈہ نے گمراہ کیا ہے۔ کیونکہ پاکستان میں عوامی حکومت اور معروف نظم ونسق کا ڈھانچہ نہیں تھا۔ وہاں پر ایک سیاسی خلاء تھا۔ بھارت نے اس سیاسی خلاء کا فائدہ اٹھایا اور اپنے نقطہ نظر کے پھیلاؤ کیلئے انہوں نے تیزی سے کام کیا۔ نتیجتاً امریکہ، برطانیہ، فرانس اور دوسرے ممالک میں عوامی رائے متاثر ہوئی۔ بدقسمتی سے کم مارچ اور ۲۵ مارچ کے دوران جو خون خرابہ ہوا اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری طرف سے بھی غلطیاں ہوئی تھیں۔ کل میں نے کہا تھا کہ غلطیاں ہوئی تھیں اور روس کے مستقل نمائندے نے کہا کہ میں نے تسلیم کر لیا کہ غلطیاں ہوئیں تھیں۔ ٹھیک ہے، لیکن یہ کمزوری کی علامت نہیں ہے، کیا یہ کمزوری کی علامت ہے؟ کیا ہم سب غلطیاں نہیں کرتے؟ کیا بھارت اور سوویت یونین دو ایسے ملک ہیں جنہوں نے کبھی غلطیاں نہیں کیں؟ مجھ سے بھی ذاتی طور پر غلطیاں ہوئی ہیں۔ لیکن غلطیوں کا مطلب یہ نہیں کہ میرے ملک کو تباہ کر دیا جائے۔ اور میرے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ یہ حکومت کی غلطیوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ کون سی حکومت غلطیاں نہیں کرتی۔ لیکن اگر ایک حکومت غلطی کرتی ہے، تو اس کے بعد اُس ملک کو ہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے؟ برباد کر دیا جائے؟ کیا سلامتی کونسل اس سے یہ نتیجہ اخذ کرے گی کہ پاکستانی سرزمین پر بھارتی جارحیت کو قانونی حیثیت دے دی جائے۔

تو اب آپ دیکھیں گے کہ یہ معاملہ ختم نہیں ہوا۔ یہ ابھی آغاز ہے۔ باب ختم نہیں ہوا بلکہ ایک نیا باب شروع ہوا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں ایک نیا صفحہ لکھا گیا ہے۔ یہ دھونس کی سیاست کی بدترین مثال ہے ایک طرح سے یہ ہٹلر کی جارحیت کو بھی مات کرتی ہے۔ کیونکہ ہٹلر کی جارحیت کو دنیا نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ اگر دنیا اس موجودہ جارحیت کو تسلیم کر لیتی ہے تو یہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک نئے اور فسوناک باب کا اضافہ ہوگا۔ ممکن ہے پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں ایک نیا باب شروع ہو چکا ہو۔ لیکن برائے مہربانی بین الاقوامی تعلقات میں ایک نیا باب شروع نہ کریں۔ ہمارے لئے یہ دو بدو، ہر روز اور ہر منٹ کی جنگ ہے۔ لیکن دنیا کے باقی حصوں میں ایسا نہ کریں۔ برائے مہربانی اس قسم کی برہنہ، شرمناک اور بربریت سے بھرپور جارحیت کو پنپنے نہ دیں۔ پرانے دنوں

www.bhutto.org

میں عظیم جنگجو دنیا پر چھا گئے تھے۔ چنگیز خان، سوبوتائی خان، سکندر اعظم، سیزر اور اس کے بعد عظیم نپولین۔ لیکن یہ بدترین ہے۔ یہ اس سے بھی برا ہے جو دنیا کے عظیم فاتحین نے ماضی میں کیا۔ اگر اقوام متحدہ اس فتح میں فریق بنتی ہے تو یہ بہت برا ہوگا۔ اس سے بھی برا جو پہلے ہو چکا۔ آپ چھوٹے اور درمیانے ملکوں کو ہوسِ ملک گیری کے سامنے بے بس کر رہے ہیں۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے یہ مہذب تصورات کے خلاف ہے۔ یہ تہذیب اور بین الاقوامی ضابطوں، اخلاق اور انصاف کے تمام قوانین کے خلاف ہے۔

امریکہ حکومت کو پاکستان کے موقف کی حمایت پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس میں امریکہ کی حکومت سے آخر کیا جرم سرزد ہوا ہے۔ اس نے وہی نقطہ نظر اختیار کیا جو پوری دنیا میں بھارت اور پاکستان کے مسئلہ کے بارے میں ہے۔ اس حیثیت کو ۱۰۵ ملکوں کی حمایت حاصل ہے۔ ۱۰۴ سرکاری طور پر، جبکہ اصل میں ۱۰۵ کیونکہ ایک نمائندے نے صحیح بٹن نہیں دبایا۔ یہ دنیا کی آواز تھی۔ یہ ایک بین الاقوامی ریفرنڈم تھا۔ آپ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کی بات کرتے ہیں تو مجھے ۱۹۷۰ء کے انتخابات پر فخر ہے۔ کیونکہ ان انتخابات میں میری جماعت مغربی پاکستان میں سب سے بڑی جماعت کے طور پر ابھری ہے۔ لیکن یہاں پر ایک بین الاقوامی انتخاب تھا اور بھارت نے اس کا مذاق اڑایا۔ بین الاقوامی رائے پر اس رویے کے ساتھ بھارت ایک دوسرے ملک میں قومی انتخاب پر کیسے حساس ہونے کا جھوٹا دعویٰ کر سکتا ہے۔ وہی بھارت جو کشمیر میں حق رائے دہی سے انکار کر رہا ہے۔

سوویت یونین کے مستقل نمائندے نے حقیقتوں کی بات کی۔ جناب روس کے مستقل نمائندے آپ اس حقیقت پر غور کریں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ ایک بڑے ملک کے نمائندے ہیں اور آپ برتاؤ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ جس طریقے سے آپ سینہ تان کر چلتے ہیں۔ جس طرح آپ میز ٹھونکتے ہیں، آپ کا مریڈ ملک کی طرح نہیں بولتے۔ آپ زار ملک کی طرح بات کرتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ مسکرا رہے ہیں۔ لیکن میں نہیں مسکرا رہا کیونکہ میرا دل خون آلود ہے۔ ہم دوست بننا چاہتے ہیں لیکن دوست اس طرح نہیں بنتے جبکہ میرے ملک کے ٹکڑے کئے جا رہے ہیں، میرے

www.bhutto.org

ملک کو تباہ کیا جا رہا ہے، اسے ختم کیا جا رہا ہے۔

چین اور امریکہ کو تنقید کا نشانہ کیوں بنایا جا رہا ہے جبکہ پوری دنیا پاکستان کے ساتھ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے ایک بھاری سیاسی فتح حاصل کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم فوجی شکست سے دو چار ہوئے ہوں۔ لیکن ایک سیاسی فتح فوجی شکست سے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ سیاسی فتح مستقل ہوتی ہے جبکہ فوجی شکست عارضی ہوا کرتی ہے۔ امریکی حکومت نے اپنی عظیم روایت کے مطابق پاکستان کی حمایت کی ہے۔ اور میں واپس وطن جانے سے پہلے امریکہ کے عوام کے پاس جاؤں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ سچائی کیا ہے۔ امریکہ نے جیفرسن، میڈیسن اور ہیملٹن اور روز ویلٹ اور ولسن کی روایت کے مطابق پاکستان کو آزاد مملکت کے طور پر تسلیم کیا اور اس کی قومی سالمیت اور قومی استحکام کی حمایت کی۔ امریکہ سے اس میں آخر کیا جرم سرزد ہوا ہے۔ بھارتی وفد امریکہ سے اتنا ناراض کیوں ہے۔ بھارتی وفد امریکہ سے ناراض ہے۔ کیا آپ سوچ سکتے ہیں؟ اگر امریکہ بھارت کو بھاری غذائی امداد نہ دیتا تو بھارت میں قحط آ چکا ہوتا۔ اس کے لاکھوں لوگ مر چکے ہوتے۔ بھارت مشرقی پاکستان کے عوام کو کیا امید دلانا چاہتا ہے۔ وہ انہیں امید کی کون سی کرن دکھانا چاہتا ہے جبکہ اس کے اپنے لوگ مغربی بنگال کی گلیوں میں سوتے ہیں جہاں خوفناک حد تک غربت ہے۔ خوفناک ناانصافی ہے اور لوگ استحصال کا شکار ہیں۔ جب کہ مغربی بنگال میں پارلیامانی حکومت ختم کر کے صدر راج نافذ کر دیا گیا ہے۔ بھارت نے مغربی بنگال میں جو کچھ کیا، مشرقی پاکستان کیلئے، مسلم بنگال کیلئے اس سے کچھ بہتر کرنے جا رہا ہے! آج ہزاروں لوگ کلکتہ کی گلیوں میں سوتے ہیں۔ مغربی بنگال کے لوگ غریب ترین ہیں۔ بھارت کشکول لے کر چھ کروڑ ٹن خوراک کے لئے امریکہ کے پاس جاتا ہے۔ اگر وہ مغربی بنگال میں صدارتی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کیسے ہمارے بنگال میں بہتری کی سوچ سکتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کریں گے اور وقت بتائے گا کہ وہ نہیں کریں گے۔

لہٰذا امریکہ نے صحیح اور اخلاقی پوزیشن اختیار کی ہے۔ تھامس جیفرسن نے ایک دفعہ کہا تھا ''میں نے انسانی ذہن پر کئے جانے والے ہر ظلم کے خلاف دائمی مخاصمت کی قسم کھائی ہے۔'' موجودہ

www.bhutto.org

جارحیت انسانی جسم اور ذہن پر ظلم کی بہت بڑی قسم ہے۔ اس طرح امریکہ نے اپنی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ اگر کچھ گمراہ کئے ہوئے سینیٹر یہاں موجود ہوتے۔ بھٹکائے ہوئے سینیٹر جنہیں ہندوستان کے پراپیگنڈے نے گمراہ کیا ہے۔ اور اگر امریکہ کے مستقل نمائندے نیکساس سے نہ ہوتے تو میں ان نوجوان سینیٹروں سے کہتا کہ میں جمہوریہ نیکساس کیلئے انتظامی مرکز کھول رہا ہوں اور امریکہ کے سابق صدر لنڈن جانسن کو اس کا سربراہ بنا رہا ہوں۔ تاکہ ہر طرف بنگلہ دیش کا مسلک پھیلایا جا سکے۔ وہاں ایک جمہوریہ نیکساس بناتے ہیں۔ ہم نے بنگال کو ایسے نہیں خریدا تھا جیسے امریکہ نے الاسکا کو خریدا تھا۔ ہم نے اپنے علاقے کیلئے رقم نہیں دی۔ ہم نے علاقہ حاصل کرنے کیلئے ڈالر نہیں دیے۔ امریکہ کے لوگوں کو اپنی حکومت کے نقطہ نظر کو سراہنا چاہیے۔ مسلم بنگال پیسے کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی مرضی سے پاکستان کا حصہ تھا۔ ہم نے اس کو الاسکا کی طرح خریدا نہیں تھا۔ امریکا کے لوگ اس کو اس طرح کیوں نہیں دیکھ رہے؟ اور ہم عظیم جمہوریہ چین کے شکر گزار ہیں۔ ہم ہمیشہ اس کے اس موقف کی وجہ سے شکر گزار رہیں ہے جو اس نے اس سلسلے میں دیا۔ اس نے اصولوں کی بنیاد پر ہی موقف اختیار کیا۔ اور میں تیسری دنیا کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ایک منصفانہ اور درست موقف کی حمایت کی۔

اور اب سلامتی کونسل میں ہمیں ویٹو سے مایوس کیا گیا ہے۔ آیئے اس ویٹو کی ایک یادگار، ایک بڑی یادگار تعمیر کریں۔ آیئے سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی کی کمزوری اور نااہلی کی یادگار تعمیر کرتے ہیں۔ جیسا بوئیں گے ویسا کاٹیں گے۔ بائیبل کے اس فرمان کو یاد رکھیں۔ آج پاکستان نشانہ ہے، آج ہم آپ کے تجرباتی چوہے ہیں۔ کل کوئی دوسرے تجرباتی چوہے ہونگے اور آپ دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایسے واقعات کا سلسلہ کیسے خود بخود چلتا چلا جاتا ہے۔ آپ ہمیں نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ ہم یہ نہیں ہونے دیں گے۔

برطانیہ اور فرانس نے اپنا کردار ادا کرنے کیلئے ووٹ دینے سے احتراز کیا۔ اگلے روز میں نے ان دونوں بڑی طاقتوں کو بڑے ادب کے ساتھ کہا تھا، کہ انہوں نے اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش میں اپنی حیثیت گنوا دی ہے کیونکہ اب وہ صرف اس شرمناک فتح کو قبول کرنے کا کردار ہی ادا کر سکتے

www.bhutto.org

ہیں۔ برطانیہ اور فرانس نے رائے شماری میں حصہ لینے سے اجتناب کیا اور ان کا یہ اجتناب ہمیں بھاری پڑا۔ فرانسیسی منطق اور انگریزی تجربے، جو کچھ بھی یہ ہے، ہمیں بھاری پڑا ہے۔ اگر برطانیہ اور فرانس نے کنارہ کشی کے بجائے بین الاقوامی برادری کی پشت پناہی میں اپنا طاقتور کردار ادا کیا ہوتا تو صورت حال مختلف ہوتی۔ غیر جانبدار نام کا کوئی جانور نہیں ہوتا۔ آپ کوئی نہ کوئی موقف اختیار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سوویت یونین کے کردار کو سراہتے ہیں، جنہوں نے ایک موقف اختیار کیا۔ ایک غلط موقف سہی لیکن انہوں نے موقف اختیار تو کیا۔ آپ کو بھی ان معاملات میں کوئی موقف اختیار کرنا چاہیے۔ آپ یا تو انصاف کا ساتھ دیں یا ناانصافی کا۔ آپ جارح کا ساتھ دیں یا جارحیت کے شکار ہونے والے کا۔ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔ ان معاملات میں صورتحال سیاہ ہوتی ہے یا سفید، درمیانی کوئی صورتحال نہیں ہوتی۔ یا تو آپ حق کے ساتھ ہوتے ہیں یا باطل کے ساتھ۔ آپ انصاف کے ساتھ ہوتے ہیں یا ناانصافی کے ساتھ۔ آپ جارحیت کے ساتھ ہوتے ہیں یا جارحیت کے شکار کے ساتھ، اگر برطانیہ اور فرانس نے بین الاقوامی برادری کے فیصلے کی پہلے ہی اپنی پوری طاقت سے پشت پناہی کی ہوتی تو میرے خیال میں ہم اس حال تک نہ پہنچتے۔ لیکن برطانیہ اور فرانس برصغیر میں واپس آنا چاہتے ہیں، کلائیو اور ڈوپلیکس کی طرح، ایک مختلف کردار میں۔ امن پیدا کرنے والوں کے کردار میں۔ وہ اپنا ایک پاؤں یہاں اور دوسرا وہاں چاہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مشرقی پاکستان میں برطانیہ کے مفاد کا یہی تقاضہ تھا کہ وہ اس قسم کا موقع پرست کردار اپنائیں۔ کیونکہ مشرقی پاکستان میں ان کا چائے کا کاروبار ہے۔ وہ مشرقی پاکستان کی پٹ سن چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کنارہ کشی اختیار کی۔ اور مجھے فرانس کے رویے پر افسوس ہے کیونکہ ہم نے فرانس کے ساتھ اچھے تعلقات، بلکہ، بہت ہی اچھے تعلقات قائم کئے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ رویہ اختیار کیا اور اب آج برطانیہ اور فرانس کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے قرارداد پر واقعات نے قبضہ کر لیا ہے۔ پاکستان میں فرانس کیلئے بڑی خیر سگالی پائی جاتی ہے۔ وہ اتنی خیر سگالی مشرقی پاکستان میں حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ مشرقی پاکستان میں اب وقت پہلے ہی کسی اور سمت چل رہا ہے۔ جب بھارتی فوج کا

www.bhutto.org

تسلط وہاں رہے گا تو ہر روز مسلم بنگال کو وحشت انگیزی کی حد تک یاد دلاتا رہے گا کہ وہ ہندو تسلط میں ہیں۔ اور آپ اس کا نتیجہ دیکھیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ ان کو ایسے ہی رہنے دیں، کیوں نہیں؟ ان کو ایسے ہی رہنے دیں۔ ان کو سینہ تان کر چلنے دیں۔ اگر وہ مشرقی پاکستان کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں قابض فوج کی طرح رہنے دیں۔ وہ قابض فوج ہیں وہ آزادی دلانے والے کیسے کہلا سکتے ہیں۔ وہ وہیں رہیں گے اور دیکھیں گے کہ حالات کس طرح مخالف سمت میں جاتے ہیں۔

آخر میں مجھے کہنا ہے کہ میں میدان چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں ہوں، میں نے اپنی زندگی میں کبھی آڑے وقت میں دوستوں کا ساتھ نہیں چھوڑا، مجھ پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ میں نے جیلیں کاٹیں۔ میں نے ہمیشہ مشکلات کا مقابلہ کیا۔ میں آج بھاگ نہیں رہا۔ بلکہ آپ کی سلامتی کونسل کو چھوڑ رہا ہوں۔ میں ضرورت سے زیادہ ایک لمحہ بھی مزید یہاں رہنا اپنی اور اپنے ملک کی شان کے خلاف سمجھتا ہوں۔ میں بائیکاٹ نہیں کر رہا ہوں۔ آپ کوئی بھی فیصلہ مسلط کریں، کوئی بھی ایسا معاہدہ جو وارسا (ورسلز) معاہدے سے بھی برا ہو۔ جارحیت کو قانونی شکل دیں۔ تسلط کو قانونی شکل دیں۔ ہر اس چیز کو قانونی شکل دیں۔ جو ۱۵۔ دسمبر ۱۹۷۱ء تک غیر قانونی تھی۔ میں اس میں فریق نہیں بنوں گا۔ ہم لڑیں گے۔ ہم واپس جائیں گے اور لڑیں گے۔ میرا ملک مجھے پکار رہا ہے۔ کیوں میں یہاں سلامتی کونسل میں اپنا وقت ضائع کروں۔ میں اپنے ملک کی طرف سے دستبرداری کی شرمناک کارروائی میں فریق نہیں بنوں گا۔ آپ اپنی سلامتی کونسل اپنے پاس رکھیں۔ یہ رہی۔ میں جا رہا ہوں۔''

بھٹو صاحب کی یہ جرأت مندانہ تقریر اپنے دور کا ایک یادگار ہے۔ پاکستان خواہ دنیا اسے آج بھی یاد کرتی ہے۔ لیکن اب وہ تاریخ کا ایک اہم دن قریب آ رہا تھا، ایک ایسے کارنامے کا دن جو کہ پاکستان کی تاریخ کا یادگار ترین واقعہ بننا تھا۔ یہ واقعہ شملہ معاہدہ ہے، بھٹو صاحب کی خارجہ پالیسی کے حوالہ سے اسے ایک تاریخ ساز اہمیت حاصل ہے۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے بعد بھٹو صاحب ملک سے باہر تھے۔ لیکن یہاں حالات

www.bhutto.org

یحییٰ خان کے کنٹرول میں نہیں آ رہے تھے۔ کیونکہ بھارت نے پاک ایر اضی کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور تقریباً ۹۳ ہزار جوان بھارت میں جنگی قیدی بنے ہوئے تھے۔ عالمی سطح پر یہ خواہش ظاہر کی جا رہی تھی کہ دونوں ممالک مذاکرات کی ٹیبل پر آئیں۔

یحییٰ خان اپنی پوری ٹیم کے ساتھ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کر رہا تھا، پاکستان میں کوئی بھی ایسی معتبر سیاسی شخصیت نہ تھی جو کہ بھارت سے مذاکرات کرنے اور ان کو کامیاب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

ملکی تاریخ کی اس نازک گھڑی کے وقت بھٹو صاحب ہی تھے جو اس صورت حال کا سامنہ کر سکتے تھے اور اسے پاکستان کے مفادات میں استعمال کر سکتے تھے۔ لہٰذا اور کوئی چارہ نہ دیکھتے ہوئے، اس وقت کی فوجی حکومت نے رضا کارانہ طور پر اقتدار سے دستبردار ہونے اور اقتدار بھٹو صاحب کو سپرد کرنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ ملک میں فوجی شکست کے بعد ایک محرومی کے احساس نے جنم لیا تھا، جس نے پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے۔ پیپلز پارٹی ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مغربی پاکستان میں واضح اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئی تھی۔ اس لئے اقتدار پر اسکا حق بھی بنتا تھا۔

بھٹو صاحب کو ملک واپس بلایا گیا، انہوں نے آتے ہی ہنگامی حالات میں صدارتی حلف اٹھایا اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی اضافی چارج بھی مجبوراً انہیں لینی پڑی، کیونکہ ملک میں عوامی حکومت موجود نہیں تھی جو پیپلز پارٹی کو اقتدار منتقل کرتی۔

حلف اٹھانے کے بعد بھٹو صاحب نے صدارتی خطاب کیا اور کہا کہ:

''ہم نئے پاکستان کی تعمیر کریں گے، ہم ایک خوشحال اور ترقی پسند پاکستان کی تعمیر کریں گے، ایسا پاکستان جو ہر ایک استحصال سے پاک ہو، جو قائداعظم کا خواب تھا۔''

عالمی برادری کے دباؤ اور بھٹو صاحب کی کوششوں سے بھارت مذاکرات کیلئے راضی ہوا۔ یہ مذاکرات شملہ کے مقام پر طے پائے۔ بھٹو صاحب صدر کی حیثیت سے بھارت روانہ ہوئے۔

www.bhutto.org

ان کی پیاری بیٹی محترمہ بینظیر بھٹو بھی اس تاریخی سفر میں ان کے ساتھ تھیں۔ پاکستان کی پوزیشن بہت کمزور تھی۔ دوسری طرف بھارت ایسے بیانات دے چکا تھا جن سے اندازہ لگایا جا رہا تھا کہ وہ اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھائے گا۔ خاص طور پر مذاکرات کی کامیابی کو بھارت، لائن آف کنٹرول کو مستقل سرحد قرار دینے اور بنگلہ دیش کو قبول کرنے سے مشروط کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں بھارتی حکومت اقوام متحدہ میں ۱۵ دسمبر کو بھٹو صاحب کی تقریر سے بھی بہت خائف تھی، یہ ہی نہیں بھارتی حکومت یہ بھی یقین دہانی چاہ رہی تھی کہ پاکستان میں جمہوریت بحال رہے گی۔ ایسی صورت حال میں بہت کم امکانات تھے کہ مذاکرات کامیاب ہوں گے۔ لیکن بھٹو صاحب کو اپنے آپ پر بھروسہ تھا کہ وہ کامیاب ہو کر لوٹیں گے۔

بہرحال دونوں ملکوں کے وفود کے درمیان مذاکرات کا باقاعدہ آغاز ہوا اور اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ ہندوستانی وفد کا ان نقطوں پر زور تھا کہ پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم کرے، کشمیر میں موجودہ سیز فائر لائین کو مستقل سرحد تسلیم کرے، مسلح افواج اور اسلحہ پر آنے والے اخراجات سے بچنے کیلئے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرے وغیرہ۔ پاکستان نے جنگی قیدیوں اور مقبوضہ پاکستانی علاقے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ بھارت اپنے شرائط پر ڈٹ گیا تھا اور اس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مذاکرات ڈیڈ لائین کی طرف جا رہے تھے۔ بھٹو صاحب ان کے شرائط کو قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ وہ کوئی معاہدہ نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ان کی ذات پر کوئی حرف آئے اور جو ملک وقوم کے مفادات کے منافی ہو۔ چار دن تک مذاکرات چلتے رہے لیکن نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔ بھارت کے غیر لچکدار رویے کے سبب مذاکرات ناکامی کی طرف جا رہے تھے۔ آخر وہ دن بھی آیا جب پاکستان کے وزیر خارجہ عزیز احمد کو بھٹو صاحب نے کہا کہ وہ بھارتی حکومت کو سرکاری طور پر مطلع کر دے کہ پاکستانی وفد واپسی کیلئے تیار ہے۔ بھارت یہ سمجھ رہا تھا کہ پاکستان کی پوزیشن کمزور ہے لہٰذا وہ بھارتی شرائط کو قبول کرے گا۔ لیکن جب بھٹو صاحب نے واپس جانے کی اطلاع دے دی تو بھارتی حکومت کو بھی کچھ ہوش آیا۔ کیونکہ مذاکرات کی ناکامی صرف پاکستان کیلئے ہی نہیں بلکہ دونوں ملکوں کیلئے نقصان کار تھی۔ اگر بھٹو صاحب

www.bhutto.org

بغیر کسی معاہدہ کے ملک واپس آتے تو جنوبی ایشیا میں کشیدگی کا ذمہ دار بھارت کو ہی ٹھہرایا جاتا۔ لہٰذا بھارت کو بھی پریشانی ضرور ہوئی کیونکہ اسے یقین تھا کہ قائد عوام معاہدہ ہی کرنے آئے ہیں، لیکن صورت حال بدل چکی تھی۔ اس اطلاع کے بعد اندرا گاندھی نے ایک چائے پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ بھٹو صاحب اس ملاقات کو آخری کوشش کے طور پر آزمانے کیلئے پوری طرح تیار تھے۔ اس دعوت میں جب دونوں رہنماذوالفقار علی بھٹو اور اندرا گاندھی کی ملاقات ہوئی تو وہ ایک رسمی ملاقات کے بجائے مذاکرات میں بدل گئی اور یہ مذاکرات ایک معاہدہ پر ختم ہوئے۔ چونکہ یہ رسمی ملاقات تھی اس لئے وہاں پر ٹائپ رائیٹر اور دوسری مطلوبہ اشیاء موجود نہ تھیں، یہاں تک کہ معاہدہ طے ہونے کے بعد اندرا گاندھی نے اپنی مہر بھی اپنی رہائشگاہ سے منگوائی۔

معاہدہ میں ان باتوں پر اتفاق کیا گیا کہ بین الاقوامی سرحد کے آس پاس دونوں ملک ایک دوسرے کے مقبوضہ علاقے ایک دوسرے کے حوالے کریں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کے دو اہم صوبوں سندھ اور پنجاب کا تقریباً پانچ ہزار ہم چورس میل رقبہ پاکستان کے حوالے کیا جائے گا۔ پاکستان کے قبضہ میں صرف ۷۰ میل بھارتی اراضی تھی جو اسے خالی کرنی ہوئی۔ اس معاہدہ میں جنگی قیدیوں کی رہائی کی کوئی بات نہ تھی۔

معاہدہ طے پانے کے وقت اندرا گاندھی نے یہ شرط ڈالی تھی کہ پاکستان قیدیوں کی رہائی یا مقبوضہ زمین کی واپسی میں سے ایک انتخاب کرے۔ بھٹو صاحب نے مقبوضہ علاقے خالی کرنے پر اتفاق کیا۔ جب کہ قیدیوں کی رہائی کو بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے مشروط کیا گیا۔ بھٹو صاحب نے بروقت بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا اس کیلئے کچھ دنوں کی مہلت چاہی۔

اوپر کہا گیا ہے کہ اس تاریخی دورہ میں محترمہ بینظیر بھٹو بھی بھٹو صاحب کے ساتھ تھیں۔ جب وہ مذاکرات کے کمرے سے باہر آئیں تو وہ بیتاب کھڑی تھیں۔ محترمہ نے معاہدہ کے بارے میں پوچھا تو بھٹو صاحب نے تفصیل بتائی۔ اس نے کہا کہ بابا اگر جنگی قیدی آزاد ہوتے تو پاکستانی بہت خوش ہوتے۔ جس کے جواب میں بھٹو صاحب نے کہا کہ وہ ضرور آزاد ہونگے۔ قیدی انسانی

www.bhutto.org

مسئلہ ہیں اور ان کی تعداد بھی بہت بڑی ہے۔ اتنی بڑی تعداد کو بھارت زیادہ وقت تک اپنے پاس نہیں رکھ سکتا کیونکہ ان کی رہائش اور کھانا پینا ہی بھارتی حکومت کیلئے مسئلہ بن جائے گا۔ ایراضی انسانی مسئلہ نہیں ہے اس لئے وہ ملک میں شامل کی جاسکتی ہے۔

بھارت اور بنگلہ دیش سے اختلافات دور کرنے کیلئے بھٹو صاحب نے بہت سارے ممالک کے دورے کئے۔ وہ اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کرانے میں کامیاب ہوئے۔ جس میں اسلامی دنیا کے بہت بڑے سربراہان شامل ہوئے۔ مثلاً مصر کے صدر انور سادات، سعودی عرب کے شاہ فیصل، لیبیا کے کرنل قذافی، پی۔ ایل۔ او کے یاسر عرفات کے علاوہ عرب امارات، کویت، قطر اور بحرین کے امیر شامل ہوئے۔ او آئی سی کا سربراہ بھٹو صاحب کو منتخب کیا گیا۔ اس کانفرنس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ مجیب الرحمن کو خاص طور پر پاکستان بلوایا گیا اور وہ شرکت کرنے کیلئے پاکستان آیا تو اس کا لاہور میں بڑی گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ اسلامی کانفرنس بھٹو صاحب کے سفارتی کارناموں میں سے اہم کارنامہ ہے۔ اور اس کو سب سے بڑا اسلامی اجتماع قرار دیا گیا۔ یہ سب بھٹو صاحب کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا۔ اس کانفرنس میں مجیب الرحمن پر اسلامی سربراہوں نے دباؤ ڈالا کہ وہ پاکستان کے فوجیوں پر مقدمہ چلانے والے خیال سے دستبردار ہو جائے۔ مجیب الرحمن انکار نہ کر سکے۔ اس طرح پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا۔ صرف پاکستان نے ہی نہیں پوری اسلامی دنیا نے بھی۔ مجیب الرحمن اتنی بڑی عزت اور استقبال سے بہت خوش ہو کر اپنے وطن لوٹ گئے اور پاکستانی فوجیوں کو رہا کر دیا۔ اس طرح سانحہ ڈھاکہ کے بعد علاقے میں جس بے چینی اور انتشار کی کیفیت نے جنم لیا تھا، وہ درگزر ہوگئی اور حالات ایک مرتبہ پھر معمول پر آنے لگے۔ شملہ معاہدہ اور اس کے بعد اسلامی کانفرنس کے ذریعے اسلامی دنیا کو ایک جگہ اکٹھا کرنا اور پاکستان کے اندرونی مسائل کا حل تلاش کرنا اور بھارت اور بنگلہ دیش سے پرامن طریقے سے اختلافات ختم کرنا بھٹو صاحب کی عملی خارجہ پالیسی کی بہت بڑی مثال ہے جس کو پاکستان سیاسی تاریخ میں ایک اہم اور شاندار باب کی حیثیت حاصل ہے۔

www.bhutto.org

شملہ معاہدہ پر آ کر ہم اپنے موضوع کو سمیٹتے ہیں اور اوپر کی گئی باتوں سے بطور مجموعی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ بھٹو صاحب ہی پاکستان کی جدید خارجہ پالیسی کے خالق تھے، انہوں نے غیر جانبدار اور آزاد خارجہ پالیسی وضع کی اور اس پر عمل درآمد کیا۔ ان کی خارجہ پالیسی پاکستان کی حفاظت، سلامتی قومی مفادات اور عوام کے امنگوں اور خواہشوں کی آئینہ دار ہے۔ ان کی خارجہ پالیسی اور ان کی ذاتی کوششوں کا ہی کمال ہے کہ پاکستان آج تک نہ صرف دفاعی اور سیاسی میدان میں مضبوط ہے اور اس کے ساتھ ملک کے اسلامی دنیا سے نظریاتی تعلقات بھی قائم ہیں۔

www.bhutto.org

بھٹو اور ایٹمی پروگرام

آپ جانتے ہیں کہ ہم فکر قائد عوام کے مختلف پہلوؤں پر بات کر رہے ہیں۔ ان کی ذات کے بہت سارے زاویے ہیں، بہت سارے عکس ہیں، جنہیں قلمبند کرنا یا زبان سے بیان کرنا ایک بڑے مدبر اور مفکر کا کام ہو سکتا ہے، ان کے خیالات کی گہرائی اور احساسات کی وسعتوں کو چھونے کیلئے اتنا ہی بڑا ہونا چاہیے، جتنا کہ قائد عوام خود تھے۔ میں پیپلز پارٹی کے ایک کارکن اور بھٹو صاحب کے ایک عقیدتمند کی حیثیت سے آپ سے مخاطب ہوں، بلاشبہ مجھ جیسے تو لاکھوں کروڑوں ہیں لیکن وہ اپنی مثال بس آپ ہی تھے۔ میں بھی ان لاکھوں کروڑوں لوگوں سے تعلق رکھتا ہوں، جن کے سکھ اور خوشی کیلئے وہ دار پر لٹکنے سے بھی نہ گھبرائے۔ وہ ہمارے محبوب لیڈر تھے، وہ ہمارے نجات دہندہ تھے، ہماری خواہشوں اور امنگوں کے پاسبان اور ترجمان تھے اور ہمارے درد کی دوا تھے۔

وہ امن عالم کے خواہاں تھے، ان میں بدی اور شر کی طاقتوں سے لڑنے کی طاقت تھی، وہ پاکستان کو ایک محفوظ، باوقار اور ترقی یافتہ ملک کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے، اسے ایک مثالی ریاست کی شکل دینا چاہتے تھے۔

ملک و قوم اور پوری دنیا کیلئے انہوں نے بہت بڑی خدمات اور کارنامے سرانجام دیئے تھے، انہوں نے اندرون ملک خواہ بیرونی دنیا میں ظلم و استبداد کی قوتوں سے لڑائی لڑی تھی۔ وہ اس دنیا کو آپ اور ہم سے بہتر جانتے اور سمجھتے تھے۔ انہیں یہ پتہ تھا کہ اس دنیا کی ضروریات کیا ہیں اور پاکستان کو کیا چاہیے۔

آج ہم بھٹو صاحب کے ایک ایسے کارنامے کا ذکر یہاں پر کریں گے، جس کی وجہ سے جنوبی ایشیا اور اقوام عالم میں پاکستان کو ایک خاص حیثیت حاصل ہوئی ہے۔ جس کارنامے کی وجہ سے نہ صرف کسی حد تک علاقائی توازن برقرار ہے بلکہ پاکستان ایک محفوظ دائرہ میں کھڑا ہے۔ وہ کارنامہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام ہے، جس کے خالق قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو تھے۔

اگر میں آج آپ کے بجائے امریکہ یا یورپ میں کسی فورم پر پاکستان کے ایٹمی پروگرام

www.bhutto.org

کے حق میں بات کر رہا ہوتا تو شاید امن عالم کا مخالف سمجھا جاتا، کیونکہ آج کی یہ دنیا ایٹم بم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ ایٹمی اسلحہ نے جو دہشت پھیلا رکھی ہے، وہ اس دنیا کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ ہر اس قدم کی مخالفت کرے، جو کہ انسانیت کیلئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ایٹم بم کو بھی منفی نظر اور نظریے سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ایک عالمی سچ ہے جس سے کوئی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ دنیا کو جنگ نہیں امن چاہیے۔ امن اس دنیا کی سب سے بڑی خواہش اور اولین ترجیح ہے۔ ہم جو پاکستان میں رہتے ہیں، وہ بھی امن کے خواہشمند ہیں، یہاں پر بھی قلب حزیں سے آہیں نکلتی ہیں، یہاں پر بھی لوگ اپنی اور دنیا کی سلامتی کیلئے سر بسجود ہیں، یہاں پر بھی آسمانوں کی طرف ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں اور لب پر خیر و نیکی کا ذکر پایا جاتا ہے۔ ہم پاکستانی بھی ساری دنیا کے عوام کے ساتھ ہیں۔

میں اپنی بات پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ ہم آج قائد عوام کے جس پہلو پر بات کر رہے ہیں، وہ دنیا میں بہت متضاد سمجھا جاتا ہے اور بڑی حد تک اس مسئلہ یعنی ایٹمی پروگرام کو دنیا کے امن پسند عوام اور دانشوروں، ادیبوں اور صاحبانِ دل و دماغ مسترد کرتے ہیں اور ہم انہیں یہاں غلط نہیں کہیں گے، کیونکہ جس زاویے سے وہ دیکھ رہے ہیں ان کا سچ یہی ہے اور جس موڑ پر ہم ایک قوم کی حیثیت میں کھڑے ہیں، وہاں سے ہماری حقیقت الگ ہے۔ پاکستان کا ایٹمی قوت بننا اس دنیا کو نا گوار گزرا ہے، مگر ہمارے لئے یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ اس سے ہم اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ عالمی اور علاقائی سچ میں فرق ہے۔ یہ الیہ ہمارا نہیں ہے، اس دنیا کا ہے، جو کہ ایٹمی طاقت کے وسیلے محفوظ بنائی گئی ہے اور ایک خوف ہے جو کہ سب کو ایک دائرے میں رہنے کیلئے مجبور کر رہا ہے، اس سے باہر آنے کو کوئی تیار نہیں ہے۔

اس دنیا کے خواب رومانوی ہیں، ان کی خواہشیں اور امنگیں رومانوی ہیں، ان کے سوچنے کا انداز رومانوی ہے، یہ رومانویت ایک الگ پر فریب اور مسحور کن جہان رنگین ہے جس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ''امن عالم''، ''بقائے باہمی'' اور ''جیو اور جینے دو'' یہ سب نعرے رومانوی ہیں، جو کہ انسانی خوابوں اور خواہشوں کی تخلیق ہیں۔ لیکن اس صورت اور صورت حال کے برعکس اس وقت دنیا کے نقشہ پر موجود ریاستوں کے اپنے اصول ہیں، جن پر ریاستوں کو چلایا جاتا ہے۔ یہ اصول ٹھوس اور سنجیدہ نوعیت کے ہوتے ہیں اور ہر ایک ریاست اپنے اصول اپنے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کرتی

www.bhutto.org

ہے۔ ہر ایک ریاست اپنے عوام کی خواہشات، بدلتے حالات کا تقاضا اور اپنی سلامتی اور مفادات سامنے رکھ کر اصول اور معیار طے کرتی ہے، جن میں رومانویت کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ رومانویت اپنی جگہ پر کوئی بری چیز نہیں ہے۔ اس دکھ بھری دنیا میں انسان کے جینے کا سہارہ ہے، اس کی روحانی تسکین کا ذریعہ ہے، یہ رومانویت فردی سطح تک تو ٹھیک ہے، لیکن جب وہ کسی پوری قوم یا ملک پر حاوی ہو جائے تو اس کیلئے تباہی کا سبب بنتی ہے۔

آیئے اس پہلو پر مزید کھل کر گفتگو کرتے ہیں کہ پاکستان کو ایٹمی پروگرام قائم کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

اس سوال کے جواب میں، میں آپ سے یہ کہنا چاہوں گا کہ اس دنیا میں وہی زندہ رہ سکتا ہے، جس میں زندہ رہنے کی خواہش موجود ہو اور اپنے حفاظت کے گُر اور ہنر سے بھی واقف ہو۔ Survival of Fittest کا اصول آج بھی قائم ہے۔ یہ تصور پرانا یا فرسودہ نہیں ہوا، اس کے برعکس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ زمانہ جدید کے حالات یہ اشارہ کر رہے ہیں کہ سب سے پہلے اپنی حفاظت کو ترجیح دینی چاہیے۔ جس طرح ایک فرد اپنے جینے کیلئے سب کچھ کرتا ہے۔ اسی طرح ایک قوم کو بھی اپنی حفاظت اور سلامتی کیلئے خاص انتظام کرنا پڑتا ہے۔ میں یہ بات آپ پر واضح کرتا چلوں کہ اسلحہ کی اس دوڑ میں پاکستان اپنے شوق سے نہیں، بلکہ مجبوری سے شامل ہوا تھا/ ہے۔ اس کیلئے حالات اتنے ناگزیر تھے کہ اسے مجبوراً ایٹمی طاقت حاصل کرنے کی جستجو کرنی پڑی۔

جب جاپان کے شہروں ناگاساکی اور ہیروشیما پر امریکہ نے ایٹم بم پھینکے تو اس دنیا نے تباہی کا وہ منظر دیکھا جو کہ اس نے تاریخ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور دنیا آج تک اس تباہی سے خوف زدہ ہے۔ ناگاساکی اور ہیروشیما میں دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں جسم گلنے اور پگھلنے لگے، جلنے اور جھلسنے لگے، آگ اور دھواں آسمانوں سے جا کر ٹکرایا اور انسانی تاریخ کا ایک کربناک باب لکھا گیا، جس کو آج بھی پڑھنے یا دہرانے کی کوئی جرأت نہیں کرتا۔ یہ ایک بھیانک تباہی تھی، جس کو آنی والی نسلوں نے بھی بہت زیادہ بھگتا ہے۔ اس کے بعد امریکی اور یورپی عوام سمیت ساری دنیا کی ہمدردیاں جاپان والوں کے ساتھ تھیں، اس عالمی قضیہ پر لاکھوں آنکھوں نے آنسو بہائے،

www.bhutto.org

سینکڑوں دامن بھیگے، تو کیا دوسری جنگ عظیم کے اس ہولناک سانحے کے بعد اس دنیا نے اپنی رضامندی سے اور آئندہ ایسا منظر نہ دیکھنے کی غرض سے اپنے سبھی ایٹمی ہتھیار ناکارہ کر دیئے؟

کیا آپ اس بات پر حیران نہیں ہو رہے کہ اتنی بڑی تباہی کے بعد بھی امریکہ اور دوسری بڑی طاقتوں نے اپنا اپنا ایٹمی پروگرام وائنڈ اپ نہیں کیا!!

دوسری جنگ عظیم کے بعد کیا ہوا، ایک نئی جنگ شروع ہوگئی، بارود تیار کرنے اور بانٹنے کا کاروبار عام ہوا، اس کاروبار میں امریکہ اور سوویت یونین پیش پیش تھے۔ ایک جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد اس دنیا نے نئے خواب تو سجائے، ایک نئی دنیا کی تمنا کی، ادارے قائم کیے گئے، بقائے باہمی، مشترکہ تعلقات کی اصطلاحات نے جنم لیا۔ اقوام متحدہ کا عظیم ادارہ قائم کیا گیا، تو کیا ان سبھی اقدامات کا دنیا پر کوئی فرق پڑا، کیا امن کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا؟ کیا ''جیو اور جینے دو'' کے اصول کی آبیاری کی گئی؟

حقیقت تو یہ ہے کہ ایک جنگ کے بعد دوسرے جنگ کے سائے دنیا کے سر پر اپنے خوفناک پر کھولے منڈلانے لگے۔ دو عظیم طاقتیں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔ انہوں نے اپنے اپنے بلاک قائم کر لیے، جن میں شامل ہونے کیلئے باقی دنیا کو مجبور کیا گیا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مختلف ممالک کو اپنے کلب میں شامل کرنے کیلئے ان دو بڑی طاقتوں نے زیادہ سے زیادہ خطرناک اسلحہ تیار کیا اور دنیا میں بانٹا، جس میں ایٹمی اسلحہ بھی شامل تھا۔

امریکہ نے ناگاساکی اور ہیروشیما کی تباہی سے کیا سیکھا؟ اپنے اس قدم پر ندامت محسوس کرنے کے بجائے اس نے ڈرانے دھمکانے کی پالیسی اختیار کی اور اپنی ایٹمی صلاحیت پر فخر کرنا شروع کیا، جو کہ آج تک برقرار ہے۔ سرد جنگ کے دوران دو بڑی طاقتوں کی پالیسی کا تانا بانا کیا تھا؟ آیئے اس سلسلے میں قائد عوام کے مارچ ۱۹۶۲ء میں لکھے گئے مضمون ''تخفیف اسلحہ کے مسائل'' سے حوالہ لیتے ہیں:

''ایک اور مسئلہ جو بڑی طاقتوں کی تعداد میں مزید اضافے کا ہے، بہت سے ممالک ایٹمی ہتھیاروں کیلئے جوہری مواد تیار کرنے میں بڑے زور و شور سے مصروف ہیں تاکہ وہ اپنے آپ کو ایٹمی کلب میں شامل کر سکیں۔ ہم اسے سنگین نتائج کی حامل صورت حال ہی کہہ سکتے ہیں جو بالآخر دنیا کے

www.bhutto.org

مختلف خطوں میں توازن برباد کرنے پر منتج ہوگی اور نتیجتاً تناؤ اور امن کیلئے خطرات کو زیادہ سنگین کردے گی۔"

قائد عوام کی اس بات میں "مزید ملک" کے الفاظ توجہ طلب ہیں، یہ اشارہ بھارت کی طرف تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس وقت تک پاکستان ایٹمی اسلحہ کی دوڑ میں شامل نہ تھا، لیکن ٹھیک تین سال بعد جب ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور بھارت کے مابین جنگ لڑی گئی تو اس کے بعد پاکستان نے اس دوڑ میں شامل ہونے کی ضرورت محسوس کی۔ یہ اس کی علاقائی اور اندرونی مجبوری تھی۔ اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا، کیونکہ اس وقت تک یہ خبریں عام ہو چکی تھیں کہ بھارت نے ایٹم بم تیار کرلیا ہے۔

سمیتو کوٹھاری (Smitu Kothari) اور ضیاء میاں نامی دو شخص ہیں، جنہوں نے مئی ۱۹۹۸ء کے ایٹمی دھماکوں کے بعد "Out of the Nuclear Shadow" (ایٹمی سائے سے باہر) نامی ایک کتاب مرتب کی، جس کے پیش لفظ میں انہوں نے یہ تصدیق کی ہے کہ تقسیم ہند کے بعد سے بھارت ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کیلئے میدان میں کود پڑا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۹۵۰ء کی دہائی کی شروعات سے سینکڑوں بھارتی سائنسدانوں کو امریکہ میں ایٹمی سائنس اور انجینئرنگ کی تعلیم دی گئی اور ۱۹۷۴ء کے قریب ان کی تعداد اندازاً گیارہ سو تھی۔ جن کو بھارتی سیاستدان اور سیاسی جماعتیں ایٹمی ہتھیار بنانے کی ترغیب دیتی رہیں۔"

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

"یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ مئی ۱۹۹۸ء میں بھارت کے جانب سے کیے گئے ایٹمی دھماکوں کا تجربہ پہلا واقعہ نہیں تھا، اس سے پہلے ۱۹۷۲ء میں اندرا گاندھی نے ایٹمی ہتھیار آزمانے کا فیصلہ جاری کیا تھا، جس پر عملدرآمد کرتے ہوئے ۱۹۷۴ء میں ایٹمی دھماکہ کیا گیا۔"

اس نقطہ پر آ کر آپ قائد عوام کے 'مزید ممالک' والے اشارے کو سمجھ سکتے ہیں۔ ایک اندازہ ہے کہ ۱۹۶۶ء تک بھارت ایٹمی بم بنانے کی صلاحیت سے ہم کنار ہو چکا تھا۔

یہ دونوں حضرات اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

"India's obsession became Pakistan's choice"

www.bhutto.org

یعنی: ''بھارت کا (ایٹمی) جنون پاکستان کیلئے (ایٹمی طاقت کے حصول کا) انتخاب بنا۔''

پاکستان نے ۱۹۵۴ء کو چھوٹے پیمانے پر اٹامک انرجی کمیشن قائم کیا تھا۔ جو کہ ''ایٹم برائے امن پروگرام'' کا ایک معمولی حصہ تھا، یہ پروگرام امریکہ کی مدد سے شروع کیا گیا تھا۔

جب بھارت کی طرف سے ایٹمی صلاحیت کی کامیابی سے متعلق خبریں عام ہوئیں، تو پاکستان کو بھی اس طرف توجہ دینا پڑی، کیونکہ دونوں ملک روایتی حریف تھے اور ان کے درمیان بہت سارے اختلاف موجود تھے اور سرحدی جھڑپوں کے علاوہ جنگیں بھی لڑ چکے تھے، لہٰذا پاکستان کو اپنا وجود خطرے میں نظر آیا۔

اقبال احمد نے ۱۷-مئی ۱۹۹۸ء کو روزنامہ ڈان میں ایک مضمون، "India's obsession, our choice" (بھارتی جنون ہمارا انتخاب) کے عنوان سے لکھا۔

جس میں وہ بتاتے ہیں کہ:

Pakistan's objectives in developing nuclear weapons are different form india. Delhi's nuclear programme has been linked to quest, however misguided, for power Islamabad's is related to security. What Pakistan has sought, is a shield against India's nuclear power.

''ایٹمی ہتھیار بنانے میں پاکستان کے مقاصد بھارت سے مختلف ہیں۔ دہلی کا ایٹمی پروگرام طاقت کی (گمراہ) جستجو سے تعلق رکھتا ہے، جبکہ اسلام آباد کا ایٹمی پروگرام سکیورٹی کے متعلق ہے۔ اس سے پاکستان کو کیا حاصل ہوا وہ (بس) بھارتی ایٹمی طاقت کے خلاف ڈھال ہے۔''

یہاں سے آپ ٹھیک اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام اپنے دفاع کیلئے ہے۔ امن عالم کو خطرے میں ڈالنے کیلئے نہیں۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کیلئے قائد عوام کو کون کون سے مشکل مراحل سے گزرنا پڑا اس سلسلہ میں قائد عوام کی ایک نایاب تحریر یہاں پر پیش کرنا چاہوں گا، جو کہ انہوں نے جیل کی کال

www.bhutto.org

کوٹھری میں لکھی تھی۔ یہ تحریر ۱۹۷۸ء میں ایک بار روزنامہ مساوات میں چھپی تھی۔ ریکارڈ کی درستگی کیلئے وہ حرف بحرف پیش کی جاتی ہے:

''تین سالہ طویل اور تفصیلی مذاکرات کے بعد مارچ سنہ ۱۹۷۶ء میں پاکستان اور فرانس کے درمیان نیوکلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ کے بارے میں معاہدہ پر دستخط کر دیئے گئے۔ فرانس، تحفظات کے مسئلہ پر قطعی مطمئن ہو گیا تھا۔ معاہدہ پاکستان کی جانب سے میری اور فرانس کی جانب سے صدر جسکارڈ دیستان کی حکومتوں کے درمیان طے پایا تھا۔ ویانا میں عالمی ایٹمی توانائی کمیشن نے اس کی تصدیق کی تھی اور کمیشن میں شامل امریکی نمائندہ نے بھی اس تصدیق کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ عالمی ایٹمی توانائی کمیشن تحفظات کے مسئلہ پر سطحی طور پر مطمئن نہ ہوتا تو اس سے اس کی تصدیق اور منظوری بھی حاصل نہ کی جاسکتی۔ اگست ۷۶ء میں، میں نے امریکہ کی جوابی تجاویز کو مسترد کر دیا اور اس وقت فرانس نے بھی امریکی مداخلت پر گہری ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک فرانس نے پلانٹ سے متعلق طے شدہ اصل معاہدہ کے بارے میں اپنا یہ مثبت موقف برابر برقرار رکھا۔

مسلسل ۱۴ ماہ تک پاکستانی عوام کی امنگوں اور خواہشات کو ابھار کر اور انہیں پورا نہ کر کے مسلح افواج کو بے یقینی اور گومگو کے عالم میں رکھنے کے بعد آخر کار جنرل ضیاء کو ۲۳ اگست ۱۹۷۷ء کو راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران یہ انکشاف و اعتراف کرنا پڑا کہ انہیں پلانٹ کے مسئلہ پر صدر فرانس سے ایک نہایت اہم مراسلہ موصول ہوا ہے۔ تاہم اس انداز بیان سے کچھ حاصل نہ ہوا اور انہیں کھل کر یہ کہنا پڑا کہ فرانس ایٹمی پلانٹ کے سودے میں مذاکرات کے ذریعے ردوبدل کرنے کا خواہاں ہے۔

صدر فرانس نے پاکستان کیلئے بے وقاری سے بچنے کا ایک راستہ کھلا چھوڑا تھا۔ تاہم وہ مجوزہ پلانٹ کی پلوٹینم کو علیحدہ کر سکنے کی صلاحیت برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ داستان کا خاتمہ فرانسیسی حکومت نے اپنے موقف کے تبدیلی کیلئے Doctrine of Rebus-Sic-Stantechur کا سہارا لیا تھا۔ فرانسیسی حکومت نے ایک قانونی اور سول حکومت سے معاہدہ کیا تھا کسی فوجی اور آمرانہ حکومت سے نہیں۔

www.bhutto.org

ایٹمی پلانٹ کا یہ معاہدہ عالمی عزت اور وقار کے حامل، پاکستان کے ایک ایسے منتخب وزیر اعظم سے طے پایا تھا، جسے فرانس کے یکے بعد دیگرے ۳ مسلسل صدور- ژیگال، پامپیڈو اور دیستان- کا یکساں طور پر اعتماد و احترام حاصل رہا تھا۔ ایک ایسے ناقابل اعتماد چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے نہیں جو خود اپنی ہی قوم سے وعدہ خلافی کا مسلسل مرتکب ہوتا رہا ہے۔ صورت حال یہ بنے گی اور اس کے ایسے خطرناک خطرات سامنے آئیں گے، میری حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش پر توجہ تک نہ دی گئی تھی۔ اس وقت ''بعد میں دیکھا جائے گا'' کا مخصوص مجنونانہ رویہ اپنایا گیا لیکن قوم کی زندگی موت کے اس اہم ترین مسئلہ کے بارے میں بزدلانہ لفاظی کا یہ طرز عمل درست نہ تھا۔ یہ ہرگز بھولنا نہیں چاہیے کہ سیاست کی خود اپنی خصالیت ہوتی ہے.....

حکومت ایٹمی پلانٹ کی اس کیفیتی تبدیلی کے خطرے سے نمٹنے کے لئے کیا کرے گی؟ مزید غیر ملکی امداد؟ اب جب کہ سرکاری طور پر یہ اعتراف کیا جا چکا ہے کہ ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ تو ہاتھ سے گیا، غیر ملکی امداد کے باوجود یا اس کے بغیر ان کو بلاشک وشبہ دوسروں کا مزید دست نگر یا محتاج ہونا پڑے گا اور پہلے کے مقابلہ میں میں نیوکلیئر بلیک میلنگ کے فن کے پیشہ ورانہ ماہروں کے رحم وکرم پر زیادہ ہوگا۔ نئی دلی کے کارٹر ڈیسائی مذاکرات کے بعد امریکی صدر کی جانب سے بھارتی وزیر اعظم کو ایک سخت خط لکھنے کی دھمکی کے باوجود بھارت کو امریکی یورینیم مسلسل فراہم ہو رہا ہے۔ اور مسٹر ڈیسائی کیلئے اس سخت خط کی دھمکی بے معنی ہوگئی ہے۔ اس کے برعکس جنرل ضیاء صدر دیستان کے اس نہایت نرم مراسلے پر سینہ پھیلائے پھرتے ہیں جس میں انہیں صاف طور پر سمجھا دیا گیا ہے کہ پاکستان کو طے شدہ معاہدہ کے تحت قابل حصول ایٹمی صلاحیت سے دستبرداری کے لئے از سر نو مذاکرات کرنے ہونگے۔ فرانسیسی نہایت مہذب قوم ہیں۔ انہوں نے دو صدیوں سے اپنے سیاسی رہنماؤں کی پالیسیوں کا طریق کار ترک کر رکھا ہے۔ یہ فطری امر تھا کہ ایک ایسے بنیادی معاہدہ سے کھلی روگردانی اور انحراف کرتے ہوئے صدر فرانس اپنی زبان کی روایتی شیرینی اور اس کے لفظ وبیان کے بے پناہ خزانہ میں سے نرم ترین اور معروف الفاظ کا انتخاب کرتے اور جنرل ضیاء کو خوبصورت ایٹمی پلانٹ کے معاہدے کی موت سے مطلع کر دیتے۔ الفاظ، بیان کی نرمی سے دکھوں اور شدائد وسزا کا ازالہ نہیں ہوا کرتا۔ لیکن تضادات کے شکار جنرل ضیاء کو اسے نہایت نرم مراسلہ قرار دے کر زخم پر توہین کی نمک

www.bhutto.org

پاشی بھی کرنی پڑی ہے۔ ہم وطنو! اتنی ذلت.....؟ ایک عمر تمنا کے خوابوں کا ایسا المناک انجام!!

میں اکتوبر ۱۹۵۸ء سے جولائی ۱۹۷۷ء تک کی ۱۹ سالہ طویل مدت کے دوران پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے نہایت سرگرم اور گہرے طور پر وابستہ رہا ہوں۔ وزیر برقیات ایندھن اور قدرتی وسائل، وزیر ایٹمی توانائی اور وزیر خارجہ کی مختلف حیثیتوں میں میرا اس سے براہ راست تعلق اور واسطہ رہا ہے۔ میں نے جب پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن سنبھالا تو یہ ادارہ صرف دفتر کے بورڈ کی حد تک اپنا وجود رکھتا تھا۔ اس کا بس نام ہی تھا۔ انتہائی مستقل مزاجی اور فولادی ارادہ کے ساتھ میں نے اپنی تمام قوت و فعالیت ایٹمی صلاحیت کے حصول کی عظیم مہم کیلئے وقف کر دی۔ میں نے نیوکلیئر سائنس کی تربیت حاصل کرنے کیلئے سینکڑوں نوجوانوں کو شمالی امریکہ اور یورپی ممالک بھیجا۔ میں نے Pins Tech کیلئے تعمیر کی ذمہ داری ایڈورڈ اسٹون کے سپرد کی اور بالآخر اس دور کے اسلام آباد جیسے ویرانہ میں اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ میں نے اس وقت کے وزیر خزانہ مسٹر شعیب اور ڈپٹی چیئرمن منصوبہ بندی کمیشن مسٹر سعید حسین جیسوں کی مجنونانہ مخالفت کے باوجود Pins Tech کیلئے ۵ میگا واٹ کے ریسرچ ری ایکٹر کے سودے کا معاہدہ طے کیا۔ میں نے کینیڈا سے ۱۳۷ میگا واٹ کے کراچی نیوکلیئر پاور پلانٹ کے قیام کی منظوری دی اور ان سب پر مستزاد ۱۹۷۶ء میں فرانس سے نیوکلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ کے حصول کے کامیاب مذاکرات بھی میں نے ہی مکمل کئے۔ تن تنہا اور صرف میری ذاتی کوششوں ہی کی بدولت پاکستان کو ایٹمی صلاحیت کی استعداد اور اس کا بالائی ڈھانچہ حاصل ہوا۔ ہمارے جیسے غریب اور غیر ترقی یافتہ ملک میں اس ضائع شدہ وقت کی کمی پوری کر لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ میں نے جب ایٹمی توانائی کے شعبہ کا چارج لیا تو پاکستان اس میدان میں بھارت سے بیس سال پیچھے تھا۔ اور جب میں وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹایا گیا تو اپنے اندازہ کے مطابق مجھے یقین ہے کہ پاکستان اس شعبہ میں بھارت سے زیادہ سے زیادہ پانچ یا چھ سال تک پیچھے رہ گیا تھا۔ اگر بعض طاقتور وزراء اور لشکر شاہی کی جانب سے اندرونی طور پر شروع ہی سے نیوکلیئر پروگرام کی شدید مخالفت نہ کی جاتی تو یہ فرق مزید کم بلکہ بہت زیادہ کم کیا جا سکتا تھا۔ ایٹمی صلاحیت کا حامل ہونے کیلئے کسی ملک کا محض امیر ہو جانا کافی نہیں اگر اس کی تنہا اور صرف یہی شرط ہوتی تو آج تیل پیدا کرنے والے ممالک کی تنظیم کے تمام رکن ممالک ایٹمی توانائی کے حامل ہوتے۔ اہم ترین پیشگی ضرورت

www.bhutto.org

بالائی ڈھانچہ کی فراہمی ہے اور اس کی خاطر میں نے غیر ممالک میں ہزاروں ایٹمی سائنسدانوں کی انتہائی ترجیحی بنیاد پر تربیت کا انتظام کیا۔ ہمارے پاس دماغی وسائل کی طاقت ہے۔ کراچی میں نیوکلیئر پاور پلانٹ بھی موجود ہے، صرف نیوکلیئری پراسیسنگ پلانٹ کی کمی تھی، بھاری پانی، یورینیم اور فیول فیبریکیٹنگ پلانٹ کی فراہمی کا بندوبست کیا جا چکا تھا۔ ہم بھرپور ایٹمی صلاحیت کی دہلیز پر پہنچ چکے تھے کہ مجھے ایوان حکومت سے موت کی کال کوٹھری پہنچا دیا گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ اسرائیل اور جنوبی افریقہ پوری ایٹمی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں۔ عیسائی، یہودی اور ہندو تہذیبوں کو بھی ایٹمی صلاحیت حاصل ہے۔ کیمونسٹ طاقتیں بھی اس سے محروم نہیں ہیں، صرف اسلامی دنیا ایٹمی صلاحیت سے محروم ہے۔ لیکن اس معاہدہ پر عمل درآمد کے بعد یہ صورتحال تبدیل ہو جائے گی۔"

اس مضمون سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ جس وقت بھٹو حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا، اس وقت تک پاکستان ایٹمی طاقت بننے کے قریب تھا۔ اس مضمون سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ بیرونی مسائل کے ساتھ بہت ساری اندرونی دشواریاں بھی تھیں اور یہ مضمون اس بات کی بھی گواہی ہے کہ حکومت سے زبردستی ایک سازش کے تحت دستبردار کیے جانے کے بعد بھی بھٹو صاحب کو اپنے ایٹمی پروگرام کی بابت بڑی تشویش تھی انہیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے ہاتھوں سے نکل کر ایٹمی پروگرام کسی حد تک غیر محفوظ ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ مضمون یہ گواہی بھی دیتا ہے کہ نہ صرف بیرونی ممالک سے بھٹو صاحب اپنے ایٹمی پروگرام کے سلسلہ میں مسلسل رابطے میں رہے بلکہ انہوں نے سینکڑوں افراد کو مختلف ممالک میں ایٹمی ٹیکنالاجی کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کیلئے بھی بھیجا۔

اس تحریر سے پہلے ۱۹۶۶ء میں بھی شہید ذوالفقار علی بھٹو نے "پاکستان اور نیوکلیائی افزودگی" کے عنوان سے ایک تحریر لکھی ہے۔ اس تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت تک پاکستان کے پاس ایٹمی صلاحیت نہ ہونے کے برابر تھی، لیکن یہ فکر ضرور لاحق تھی، کہ جتنا جلد ہو سکے ایٹمی طاقت حاصل کر لینی چاہیے، خواہ اس کیلئے کتنی بھی قیمت ادا کیوں نہ کرنی پڑے۔ بھٹو صاحب لکھتے ہیں:

"اگر بھارت نے ایٹمی طاقت حاصل کر لی ہے تو پاکستان کو بھی بھارت کے نقش قدم پر چلنا پڑے گا، خواہ اس کیلئے ہمیں گھاس ہی کیوں نہ کھانی پڑے۔"

آپ قائد عوام کی عزم کی بلندی کو محسوس کر سکتے ہیں، وہ ہر قیمت پر پاکستان کو ایک ایٹمی

www.bhutto.org

طاقت کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے اور اس کی وجہ یہ نہیں، کہ ملک یا شہید بھٹو کو ایسی طاقت کے حصول کا شوق تھا، جس کے خلاف عالمی رائے عامہ تھی، بلکہ یہ پاکستان کے اندرونی حالات اور علاقائی توازن کو برقرار رکھنے کا تقاضا تھا۔ ماضی میں ایسے بہت واقعات رونما ہو چکے تھے جن کی بناء پر بھارت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، اسی مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''ہم ان ممالک کے رویے پر بھروسہ کرنے سے قاصر ہیں، جو اپنے ہمسایہ سے نیوکلیائی خطرے سے محفوظ، اور جن کیلئے نیوکلیائی قیامت بہت دور کی کہانی معلوم ہونی چاہیے۔ پاکستان کا معاملہ قطعی مختلف ہے کیونکہ ہمارے لئے نیوکلیائی خطرہ بہت حقیقی ہے اور رگِ جاں سے بھی قریب معلوم ہوتا ہے۔''

یہ الفاظ کسی جذباتی بہاؤ کا نتیجہ نہیں ہیں، اس کے برعکس ان کا بہت بڑا پس منظر ہے۔ بھارت سے نظریاتی اور سیاسی اختلافات کی پوری تاریخ ان سطور کے پیچھے کارفرما ہے۔

بہرحال یہ بھٹو کا عزم تھا کہ ''ایٹمی طاقت بننا ہے خواہ اس کیلئے گھاس ہی کیوں نہ کھانی پڑے'' اور اس معاملے کو وہ بھارت کی نسبت سے رگِ جاں سے قریب قرار دیتے تھے۔

اس کے بعد وہ اقتدار میں آئے، تو انہوں نے اپنا عالمی اثر ورسوخ اور تعلقات کا استعمال کرنا شروع کیا۔ ۱۹۷۳ء سے ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کے حصول کیلئے فرانس سے رابطہ کیا، جس کا خلاصہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ یہاں صرف بات کرنا مقصود ہے، کہ جب پاکستان نے فرانس کے ساتھ اپنے ایٹمی تعلقات بڑھائے تو سب سے پہلے امریکہ نے اعتراضات وارد کیے کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام پرامن مقاصد کیلئے نہیں ہے۔ اس صورت حال کو آپ امریکہ اور ایران کے درمیان چلنے والے موجودہ ایٹمی تضاد کے تناظر میں پرکھ سکتے ہیں۔ ایسی ہی صورت حال سے ۱۹۷۳ء کے بعد پاکستان برسوں گزرتا رہا تھا۔ یہ وہی امریکہ تھا جس نے ۱۹۵۴ء میں پاکستان کو ایٹم برائے ترقی پروگرام کے تحت اٹامک انرجی کمیشن قائم کرنے میں مدد دی تھی۔ اب جب کہ پاکستان اپنی سلامتی اور خود حفاظتی انتظامات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایٹمی ری پراسیسنگ اور ''ہیوی واٹر'' کے سہولیات بھاری شرطوں پر فرانس اور دیگر ممالک سے خرید رہا تھا تو امریکہ کو اعتراض تھا۔ ان اعتراضات کو دو تشریحوں سے سمجھا جا سکتا تھا، پہلی یہ کہ ایشیا میں امریکہ بھارت کے مقابلے میں کسی اور ملک کو طاقت بن کر ابھرتا

www.bhutto.org

ہوانہیں دیکھ سکتا تھا، کیونکہ امریکہ نے سالہا سال کی محنت کے بعد بھارت کو چین کے مقابلے کیلئے تیار کیا تھا اور اسے ایٹمی طاقت بننے میں بھی مطلوبہ سہولیات فراہم کیں تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان نے پلانٹ اور دوسرے مطلوبہ سامان کیلئے امریکہ کے بجائے فرانس سے رابطہ کیا تھا۔ اس معاملہ کی تہہ تک جائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ فرانس وہ پہلا ملک ہے جس نے ایٹمی دھماکہ کر کے یورپ سے امریکہ کی اجارہ داری کو تقسیم کیا تھا، جس طرح پاکستان نے بھارتی ایٹمی تجربات کے جواب میں جنوبی ایشیا میں طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے کی خیال سے ایٹمی تجربہ کیا۔ پاکستان تو اللہ کے فضل سے ایٹمی قوت بن گیا، لیکن اس کیلئے قائد عوام کو بہت کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا اور یہ مراحل تختہ دار تک جا پہنچے۔

امریکی اعتراضات کے جواب میں بھٹو صاحب نے اپنی معروف تحریر ''دو طرفہ تعلقات کا نظریہ۔ نئی سمتیں'' میں وضاحتیں کی تھیں کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام پر امن مقاصد کیلئے ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے بھارت کے ایٹمی پروگرام پر بھی کئی سوالات اٹھائے تھے، آیئے اس سلسلے میں کچھ اقتباسات سے رجوع کرتے ہیں:

''میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان عناصر کی مخالفت ایٹمی طاقتوں کے دائرہ سے باہر ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ پر گہری تشویش کے سبب ہے پاکستان بھی اس تشویش میں شامل ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ پر پاکستان کے اندیشوں کا سبب، اس مسئلہ پر کسی بھی حلقہ کی انتہائی ہمدردانہ رائے سے زیادہ وزنی ہے۔ ہم رضا کارانہ طور پر بار بار اور بہت واضح الفاظ میں یقین دہانیاں کرا چکے ہیں کہ ہمارے ایٹمی پروگرام کے مقاصد پر امن ہیں مبادا یہ سمجھا جاتا کہ یہ سب کچھ محض زبانی دعوے ہیں، ہم نے اس منصوبے کے ہر ایک مرحلہ پر ایٹمی توانائی کی بین الاقوامی ایجنسی کے عائد کردہ آہنی تحفظات کو قبول کر لیا بلکہ ہم اس سے بھی دو قدم آگے گئے اور ری پراسیسنگ پلانٹ فراہم کرنے والے ملک فرانس کی وہ انتہائی کڑی شرائط بھی منظور کر لیں جو ایٹمی سامان برآمد کرنے والے سات ملکوں کے اختیار کردہ رہنما اصولوں کے عین مطابق ہیں۔ اس پلانٹ کی سپلائی کیلئے طے پانے والے معاہدے کے ساتھ بین الاقوامی ایٹمی ایجنسی کے بورڈ آف گورنرز کی اتفاق رائے کی منظوری سے سہ طرفہ تحفظات کا معاہدہ ہوا تھا۔ ہم پہلے بھی کینیڈا اور وفاقی جمہوریہ جرمنی کے ساتھ ایک ایٹمی ری ایکٹر

www.bhutto.org

اور ایک چھوٹی ہیوی واٹر پلانٹ کے استعمال کے سلسلے میں تمام مناسب احتیاطی تقاضوں کو پورا کر چکے ہیں۔ اپنے ایٹمی منصوبوں کے صرف اور صرف پرامن استعمال کے بارے میں ہمارے وعدے کی سچائی میں اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل پیش کی جاسکتی ہے۔"

"لہٰذا اپنے پرامن ایٹمی پلانٹ میں پاکستان کا آگے بڑھنا ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ کے حوالے سے کوئی خاص واقعہ نہیں۔ اس کے باوجود اسے ایک غیر معمولی واقعہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جب کہ اسرائیل جنوبی افریقہ اور بھارت کے بے قید اور بے لگام ایٹمی پروگرام معمول کے مطابق قرار دیئے جاتے ہیں یہ بھی مسئلہ کو اس کے حقیقی حسن و قبح پر پرکھنے کے اصولوں کا حشر اور اس کے ذمہ دار وہ ہیں جو خود ان اصولوں کے علمبردار بنتے ہیں۔ اور بظاہر ان سے روگردانی پسند نہیں کرتے، بھارت پہلے ہی عین ہماری سرحد پر ایٹمی دھماکہ کر چکا ہے۔ اب اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس نے متعدد ایٹمی دھماکے کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا ہے۔"

"بھارت کی موجودہ ایٹمی صلاحیت جس خام مواد اور ٹیکنالاجی سے تعمیر ہوتی ہے وہ اس نے کینیڈا سے ملنے والے ری ایکٹر اور امریکہ کے فراہم کردہ "ہیوی واٹر" سے حاصل کی ہے اور یہ دونوں سہولتیں بھارت کو ضروری تحفظات کے بغیر فراہم کر دی گئی تھیں۔ کیا یہ دھوئی کیا جاسکتا ہے کہ اس معاملہ میں جانبداری یا امتیازی سلوک نہیں برتا گیا۔ کیا اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بڑی طاقتوں کی ایٹمی اجارہ داری کو عالمی توازن اور امن کے مفادات میں منصفانہ طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ نہ صرف پاکستان بلکہ وہ تمام ملک جو ایٹمی ہتھیاروں کے مالک نہیں اس ضمن میں کسی یقین دہانی کا بڑی خوش دلی سے خیر مقدم کریں گے۔"

ان اقتباسات سے یہ حقائق سامنے آتے ہیں:

۱- پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر اعتراضات کیے جا رہے تھے، لیکن بھارت کو ایسی صورت حال نہ اس وقت، نہ اس سے پہلے کبھی درپیش تھی۔

۲- پاکستان کو ایٹمی صلاحیت کیلئے بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑ رہی تھی، جب کہ بھارت کو سب کچھ گھر بیٹھے مل رہا تھا۔

۳- پاکستان کو بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی کے سوالات کے جوابات دینے پڑ رہے تھے،

www.bhutto.org

جبکہ بھارت سے پوچھ گچھ کا دائرہ محدود تھا۔

۴- پاکستان کو کڑی شرائط پر ایٹمی سامان فراہم کیا جا رہا تھا، جبکہ بھارت کو کینیڈا سے ملنے والے ری ایکٹر اور امریکہ کے فراہم کردہ "ہیوی واٹر" ضروری تحفظات کے بغیر فراہم کئے گئے تھے۔

۵- اس وقت تک بھارت ایٹمی تجربہ (۱۹۷۴ء میں) کر چکا تھا جبکہ پاکستان ایٹمی طاقت ہونے کے مراحل سے گذر رہا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بھارت کے ایٹمی پروگرام کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا، کیونکہ ایٹمی تجربہ کرنے کے پیچھے اسے ضرورت پڑنے پر استعمال کرنے کی نیت حرکت کر رہی ہوتی ہے۔

۶- پاکستان جنوبی ایشیا میں طاقت کے توازن کو قائم رکھنے کیلئے ایٹمی قوت بننا چاہتا تھا، جبکہ بھارت کا خواب تھا کہ جنوبی ایشیا میں اس کی اجارہ داری قائم ہو۔

ان نکات کو سامنے رکھ کر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ پاکستان بالخصوص بھٹو صاحب عالمی سطح پر کتنی بڑی دشواریوں اور امتیازی سلوک، اعتراضات اور الزامات کا سامنا کر رہے تھے۔

شہید بھٹو پاکستان کیلئے آزاد تصور رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے پاکستان کو خود حفاظتی نظریے پر چلایا جائے۔ وہ بڑی طاقتوں کا باج گزار نہیں بننا چاہتے تھے۔ ماضی کے تجربات نے انہیں سکھایا تھا کہ صرف اپنی دفاعی قوت پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں مسلسل کام کرنا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھارت کے ایٹمی پروگرام پر بہت زیادہ فکرمند تھے اور چاہتے تھے کہ پاکستان بھی جلد از جلد ایٹمی طاقت بن جائے۔ کیونکہ ماضی میں جب بھی مصیبت آئی اور اپنے ہمسایہ سے ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوئی تو بڑی طاقتوں نے پاکستان کو میدان میں اکیلا چھوڑ دیا۔ ۱۹۶۲ء میں جب چین اور بھارت کی جھڑپ ہوئی تو امریکہ نے بھارت میں بارود اور اسلحہ کے انبار لگا دیئے، پاکستان نے احتجاج کیا تو اسے یہ کہہ کے خاموش کرایا گیا کہ اگر پاکستان پر کسی نے بھی حملہ کیا تو امریکہ اس کا ساتھ دے گا۔ خواہ وہ بھارت ہی کیوں نہ ہو۔ پھر جب ۱۹۶۵ء میں پاک- بھارت جنگ چھڑ گئی تو امریکہ پاکستان کو ہتھیار دینے سے مکر گیا۔ ساتھ دینا تو دور کی بات فاضل پرزہ جات بھی فراہم کرنے کیلئے تیار نہ تھا۔ یہی وہ گھڑی تھی جب پاکستان کو احساس ہوا کہ عالمی معاہدے اور ادارے اس کا دفاع نہیں کر سکتے۔ اس سلسلہ میں اسے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ اس وقت اقوام متحدہ اور اس کی سلامتی کونسل کہاں تھی؟ وہ

www.bhutto.org

کیا کر رہے تھے، بھٹو صاحب خود کہتے تھے کہ اقوام متحدہ ایک بڑا فریب ہے۔ اس رائے میں وہ بڑی حد تک صحیح بھی تھے۔ یہ جاننے کیلئے کسی پیچیدگی میں پڑنے یا کوئی پر مغز بحث کی کوئی ضرورت بھی نہیں، ایسی بہت سی مثالیں بکھری پڑی ہیں، جو کہ اقوام متحدہ کے ناکارہ ہونے کا زندہ ثبوت ہیں۔ عالمی بھائی چارہ کا دعویدار یہ ادارہ چند ممالک کا غلام بنا ہوا ہے۔ ان ممالک کے فیصلوں کے سامنے بے بس دیکھا گیا ہے۔ عالمی تنازعات کے حل کیلئے اس کے اقدامات مؤثر ثابت نہیں ہوئے مثلاً گزشتہ ۵۰ برس سے آزاد فلسطین کے قیام اور اسرائیلی جارحیت کے معاملے پر اس کا کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔ مشرق وسطیٰ کے امن کی راہ میں یہ تنازع آج بھی دیوار کی طرح موجود ہے۔

نائن الیون کے واقعات کے بعد امریکہ اور اس کے حواریوں نے افغانستان پر حملہ کیا، وہ القاعدہ کا نیٹ ورک توڑنے اور طالبان حکومت کا تختہ الٹنے کیلئے حملہ آور ہوئے تھے، بات یہاں تک تو ٹھیک تھی لیکن گولے بارود کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ اس طرح پوری افغانی نسل پر جنگ مسلط کر دی گئی۔ معصوم اور بے گناہ لوگوں کو نشانہ بنایا گیا، بستیاں اور شہر تباہ کیے گئے۔ سینکڑوں افراد مارے گئے لاکھوں اپاہج اور معذور ہوئے اور لاکھوں سر بچانے کیلئے سرحدی ممالک میں جا پہنچے۔ اس وقت یہ ادارہ کہاں تھا؟ کیا یہ انسانی حقوق کی کھلی توڑ پھوڑ نہیں تھی؟

اس کے بعد عراق پر جنگ مسلط کی گئی۔ اس مرتبہ تو اقوام متحدہ براہ راست میدان میں اترا ہوا تھا۔ اس کی سلامتی کونسل کی انسپکشن ٹیم نے دو ڈھائی مہینوں تک تحقیق کی تھی۔ حقائق قلمبند کرنے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی۔ جس میں واضح طور امریکہ کے اس دعویٰ کو مسترد کر دیا گیا تھا، جس میں اس نے کہا تھا کہ عراق کے پاس وسیع پیمانے پر انسانی تباہی پھیلانے والے ہتھیار موجود ہیں، لہٰذا انسانیت کی بھلائی اور دفاع اس میں ہے کہ صدام حکومت کے خلاف جنگ کی جائے۔ پھر کیا ہوا سارے دنیا نے آنکھوں سے دیکھا کہ امریکہ اور اس کی اتحادی فوجیں اقوام متحدہ کے قوانین کو روند کر آگے بڑھ گئی اور عراق میں داخل ہو گئیں یہ منظر ساری دنیا کے چینلز سے براہ راست دکھایا گیا۔ صدام کی حکومت کا تختہ گرایا گیا۔ دارالحکومت بغداد پر قبضہ کر لیا گیا اور پھر بستیاں، شہر، عمارتیں، اسکول، اسپتال، مقدس مقامات کو ڈھانے اور گرانے کا سلسلہ شروع ہوا، عام شہریوں کو، بچوں اور عورتوں کو نشانہ بنایا گیا، یہاں تک کہ فلوجہ کے شہر میں مزاحمت کاروں سے نمٹنے کیلئے کیمیائی ہتھیاروں کے

www.bhutto.org

استعمال کی خبریں بھی منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ابوغریب جیل کے انسان سوز واقعات بھی دنیا سے ڈھکے چھپے نہیں رہے ان جیلوں میں مسلمانوں کو محض مذہب کی بنیاد پر سزاؤں کا حقدار ٹھہرایا گیا ہے۔ ان واقعات سے مغرب کے نام نہاد ''تہذیبوں کا تصادم'' والا نظریہ آشکار ہوتا ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جا رہا ہے کہ دنیا اس وقت واضح طور پر دو حصوں پر بٹ چکی ہے ایک طرف عیسائی + یہودی اور دوسری طرف مسلمان دنیا ہے۔ یہ ایک جدید مغربی نظریہ ہے جس کی جڑیں اس دور میں پیوستہ ہیں جب مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صلیبی جنگیں لڑی گئیں تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ عیسائی نسل جدید معنوں میں مسلمانوں سے اپنا صدیوں پرانا حساب کتاب برابر کر رہا ہے۔ اس موقع پر سوال یہ ہے کہ امریکہ اور یورپی ممالک کے ایسے غیر انسانی اور غیر قانونی کارروائیوں کے سلسلے میں اقوام متحدہ کا کردار کیا ہے؟

یہ حقیقت بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ۶ دہائیوں سے کشمیر مسئلہ کے پرامن حل اور کشمیری عوام کو حق خود ارادیت دینے کے متعلق اپنی ہی پاس کی گئی قراردادوں پر یہ ادارہ عمل درآمد نہیں کرا سکا۔

بھٹو صاحب بھی اس وقت کے مختلف بحرانوں اور مشکل ادوار سے گذرنے کے بعد یہ جان چکے تھے کہ جب بھی پاکستان پر مشکل گھڑی آئے گی تو بڑی طاقتیں اور اقوام متحدہ کا ادارہ اس کے کام نہیں آئے گا۔ اس لئے پاکستان کو اپنے آپ پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھارت کو بھاری نقصانات اٹھانا پڑے اور اس کی بڑی ایراضی پر پاک افواج نے قبضہ کر لیا تھا، اس موقعہ پر یکدم بڑی قوتیں بھارت کو بچانے کیلئے میدان میں کود پڑیں، یہاں تک کہ سوویت روس اور امریکہ بھی اس معاملہ پر ایک ہو گئے تھے۔ صدر ایوب خان پر دباؤ بڑھایا گیا اور بدنام زمانہ معاہدہ تاشقند سوویت روس کی ثالثی میں طے پایا، جس میں جنگبندی کا اعلان کیا گیا اور دونوں ممالک اپنی اصلی پوزیشنوں میں جانے کیلئے رضامند ہوئے۔ بھٹو صاحب اس معاہدے کے خلاف تھے۔ وہ جنگ بندی کے خلاف نہیں تھے، لیکن یہ ضرور چاہتے تھے کہ یہ بہتر موقعہ ہے کہ پاکستان کشمیر تنازع پر مذاکرات کرے۔ انہوں نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے بہت کوشش کی لیکن ایوب خان ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس کو عالمی برادری میں سرخرو ہونے کا شوق تھا اور

www.bhutto.org

اپنے آقاؤں کو خوش کرنا تھا۔ اس نے سمجھا کہ یہ فیصلہ عالمی برادری میں اس کیلئے اچھا تاثر پیدا کرے گا اور عالمی رائے عامہ اس کے حق میں رہے گی۔

اسے یہ احساس بھی نہ ہوا کہ سوویت روس، امریکہ اور بھارت نے اس کی سادگی کا فائدہ اس طرح اٹھایا ہے جیسے شہر میں آنے والے نئے دیہاتی کو شہری ٹھگ لوٹ لیتے ہیں۔ جب یہ پاکستان کی تاریخ کا سیاہ باب لکھا جا رہا تھا تو بھٹو صاحب کی کیفیت یہ تھی جسے انہوں نے اپنے مضمون ''تاشقند کی کہانی'' میں بیان کیا ہے:

''جب اعلان تاشقند پر دستخطوں کی رسم ادا کی جا رہی تھی تو میں درد و غم اور بے بسی و مایوسی کے عالم میں ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے کامرانی کے چمن کو اجڑتے دیکھا۔ مجھے اپنے عوام کی بیش بہا قربانیاں رائیگاں جانے کا قلق تھا اور میں کشمیریوں کے لامتناہی مصائب پر رنجیدہ تھا میں نے تن تنہا ''عظیم آمر'' کی ستم رانیوں کا مقابلہ کیا یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب کی طرح تھا مجھے وفد کے ان ارکان کی اخلاقی حالت پر بھی تعجب تھا جو مجھ سے کچھ اور ایوب خان سے کچھ کہتے تھے۔''

معاہدہ تاشقند کی قلعی بھی جلد کھل گئی، جب ۱۹۷۱ء میں اس نام نہاد معاہدے کی انحرافی کرتے ہوئے بھارتی فوجوں نے پاکستان فوجوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

بڑی طاقتوں اور ان کے معاہدوں اور اقوام متحدہ کے چارٹر کی حقیقت جاننے کے بعد آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بھارت کے ایٹمی پروگرام پر قائد عوام بھٹو کی تشویش جائز اور بروقت تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وہ واحد سیاسی مدبر اور سربراہ مملکت تھے جن کی برصغیر ہندو پاک جنوب ایشیا سمیت پوری دنیا کے ماضی حال اور مستقبل پر نظر تھی۔ وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے اور بے پناہ سیاسی اور تاریخی بصیرت سے مالا مال تھے، یہی سبب ہے کہ انہوں نے سبھی تاریخی اور سیاسی عوامل کو نظر میں رکھ کر نیا پاکستان تخلیق کرنے کیلئے اپنے وجود کی سب توانائیاں صرف کیں۔ ان کے نام کے کھاتہ میں بہت بڑے اور اہم عالمی، علاقائی اور ملکی کارنامے ہیں۔ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا سہرا بھی قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کے سر پر سجا ہے۔ یہ بھی ان کے عظیم کارناموں میں سے ایک ہے۔ جس وجہ سے پاکستان خطہ اور عالمی برادری میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ یہ فصل ذوالفقار علی بھٹو کی بوئی ہوئی تھی، جو کہ ۲۸-مئی ۱۹۹۸ء میں کاٹی گئی۔

www.bhutto.org

بڑھتے بھی چلو

پاکستان پیپلز پارٹی کی قائد محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ نے سیاسی دنیا کے نئے تقاضاؤں کے پیش نظر پاکستان پیپلز پارٹی کے بہادر اور انقلابی کارکنوں کی سیاسی تعلیم و تربیت اور انہیں بدلتے ہوئے حالات، عالمی تصورات اور حکمت عملیوں سے روشناس کرانے کیلئے پارٹی میں اسٹڈی سرکل کو نئے سرے سے منظم اور فعال بنانے کے اقدام کئے ہیں۔

اسٹڈی سرکل کی اہمیت کو پارٹی کے قیام کے وقت ہی تسلیم کر کے اس کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو اسٹڈی سرکل سرگرم بھی رہا لیکن پارٹی کے کارکن ان سازشوں، دباؤ اور حالات سے اچھی طرح واقف ہیں جن سے پارٹی اپنے قیام سے لیکر آج تک دوچار ہے۔ پارٹی کارکنان اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ان کی پارٹی سازشوں، دباؤ اور بحرانوں کے سمندر کو عبور کر کے آج یہاں تک پہنچی ہے۔ انہی سازشوں اور دباؤ کے وجہ سے نہ پارٹی اپنے پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکی نہ ہی اپنی خواہشوں اور پروگرام کے مطابق اپنی سیاسی سرگرمیوں کو بہتر نتائج حاصل کرنے تک جاری رکھ سکی ہے۔

انہی سازشوں اور دباؤ کے نتیجے میں ہمارے محبوب قائد شہید ذوالفقار علی بھٹو کو جام شہادت نوش کرنا پڑا، ہزاروں کارکنوں نے کوڑے اور تشدد برداشت کیے، لاکھوں ساتھیوں نے جوانی کے حسین سال قید میں گزار دیئے، سینکڑوں بہادر کارکن ہنستے ہنستے موت کو گلے لگا کر تاریخ میں اپنا نام روشن کر گئے۔

انہی سازشوں کا نتیجہ ہے کہ ہماری موجودہ قائد محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ اپنی محبوب سرزمین اور اپنوں سے دور جلاوطنی کی زندگی گذار رہی ہیں، لیکن یہ پیپلز پارٹی کا طرہ امتیاز ہے کہ اس کی قیادت نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی عوام کی قیادت کرنے سے منہ نہیں موڑا، اور ہر حال میں، خواہ قید میں ہوں یا جلاوطنی میں، جدوجہد کی رہنمائی کا فرض نبھاتی رہتی ہیں۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو قید میں بھی اپنے افکار سے ہمیں روشنی اور حوصلہ عطا کرتے رہے، اور محترمہ بے نظیر بھٹو جلاوطنی میں ایک طرف

www.bhutto.org

ملک کے محکوم و مظلوم عوام کی وکیل بن کر پاکستان کے غیر جمہوری حالات اور عوام کے خلاف ہونے والی سازشوں سے دنیا کو آگاہ کر رہی ہیں اور دوسری طرف ملک میں جدوجہد کی رہنمائی کرتے ہوئے ہمیں سیاسی سفر کی مشکلات اور حکمت عملیوں سے روشناس بھی کرتی رہی ہیں۔ اسٹڈی سرکل کو دوبارہ سرگرم کرنا بھی رہنمائی کرنے کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اسٹڈی سرکل میں قائد عوام شہید ذوالفقار علی بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے افکار اور حکمت عملیوں کی روشنی میں اپنی پارٹی جدوجہد اور بین الاقوامی حالات اور بدلتے ہوئے نظریات پر کارکن دوستوں سے بات چیت کی جائیگی، لیکن میں نے سب سے پہلے کارکن دوستوں کے ساتھ مختصر سی لیکن نہایت ہی بنیادی باتیں کرنے کو اولیت دی ہے، کیونکہ یہ بنیادی باتیں ہماری تاریخی انقلابی سیاسی روایات اور جذبہ کو اجاگر کرنے کیلئے ضروری ہیں۔

ساتھیو! کوئی غیر معمولی انسان علم و عرفان کی منزل پر پہنچ کر، کسی فکر اور فلسفہ کی بنیاد تو رکھ سکتا ہے، مگر اس فکر اور فلسفہ کو، تنہا نافذ نہیں کر سکتا۔ فکر کے نفاذ، کامیابی اور بقاء کیلئے اس فکر کے بانی کو لازمی طور پر، بے لوث، انتھک اور خود کو وقف کرنے والے دوستوں اور ساتھیوں کی ضرورت پیش آئے گی اور ساتھی بھی متحد، منظم اور متحرک ہوں، کیونکہ نظریوں کا نفاذ منتشر لوگ نہیں بلکہ ذہنی اور عملی ہم آہنگی کے دھاگے میں پروئے منظم گروہ کرتے ہیں۔ تحریک مذہبی ہو کہ سیاسی، ذہنی اور عملی ہم آہنگی کے بغیر اپنے مقاصد ہرگز حاصل نہیں کر سکتی۔

پارٹی، افراد کی ذہنی اور عملی ہم آہنگی کی جدید اور بہتر صورت ہے اور پارٹی کا نظم و ضبط اور نظام اس ذہنی اور عملی ہم آہنگی کا مظہر ہوتا ہے جس میں پارٹی کی کامیابی کا راز پنہاں ہوتا ہے۔ قیادت، منشور، کارکن اور منزل مقصود کسی بھی پارٹی کیلئے بنیادی ضروریات ہوتی ہیں، ان کے بغیر کوئی بھی پارٹی اپنے وجود کا نہ تو اعلان کر سکتی ہے نہ ہی قائم رہ سکتی ہے اور نظم و ضبط اس کے وجود میں زندگی کے احساس کا نام ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی ملک کی جاوداں عوامی پارٹی، پارٹیوں کے بنیادی ضرورتوں کی مالک، ایک متحرک اور مکمل سیاسی پارٹی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی، پارٹیوں کے بنیادی ضرورتوں کے حوالے سے نہایت خوش نصیب سیاسی پارٹی ہے۔ قیادت کے معاملے میں تو سارے پاکستان کی سیاسی

www.bhutto.org

پارٹیوں میں اپنا سر فخر سے بلند کئے ہوئے ہے۔ کیونکہ اس پارٹی کے بانی فخرِ ایشیا، تیسری دنیا کے مدبر، قائد، حقیقی قوم پرست اور دانشور، عالم اسلام کے دوست، دنیا کی محکوم قوموں کے وکیل، اجارہ دار اور جارحیت پسند ممالک سے برسرِ پیکار رہنے والے شہید ذوالفقار علی بھٹو ہیں۔ جس کی پوری زندگی حقوق انسانی اور آزادی کیلئے عظیم الشان جدوجہد کرتے ہوئے گزری اور جس کی شہادت جمہوریت، روشن خیالی اور قوموں کی برابری کی جدوجہد میں قربانی دینے والے رہنماؤں کی تاریخ کا روشن باب ہے۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وہ واحد سیاسی رہنما ہیں جنہوں نے عوام کو طاقت کا سرچشمہ ہونے کا احساس عطا کیا۔ انہوں نے ہی ملک میں سیاسی اور معاشی اجارہ داریوں کا خاتمہ کیا۔ شہید بھٹو پاکستان میں عوامی سیاست کے بانی ہیں۔ انہوں نے ہی مزدوروں، مزارعوں اور محنت کشوں کی عزتِ نفس کو محفوظ بنانے کے اقدامات کیے۔ انہوں نے ہی پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھ کر پاکستان کے استحصال زدہ اور منتشر عوام کو متحد کرکے ایک لازوال سیاسی پلیٹ فارم فراہم کیا۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو کے بعد ان کی بہادر شریکِ حیات بیگم نصرت بھٹو نے پارٹی کی قیادت کی۔ بیگم صاحبہ نے جس جرأت اور ہمت سے آمریت اور ضیاء شاہی میں عوامی قافلے کی رہنمائی فرمائی اس پر پوری قوم کو فخر ہے۔ بیگم صاحبہ نے جمہوریت کی خاطر بے پناہ قربانیاں دیں ہیں، اذیتیں برداشت کی ہیں، ملک و قوم کی خاطر ان کی اذیتیں برداشت کرنے والی داستان طویل ہے ،ان کے صبر و حوصلہ کو قوم ہمیشہ یاد رکھے گی۔ بیگم صاحبہ پاکستان میں جمہوری جدوجہد کی علامت ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی موجودہ قائد محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ اپنے عظیم والد کی حقیقی سیاسی وارث اور پاسبان اور اپنی بہادر جمہوریت پسند والدہ کی روایتوں کی امین ہیں۔

قائدِ عوام نے جیل سے اپنی سیاسی وارث بیٹی کو لکھا تھا:

"زندگی محبت کا ملہ ہے، نیچر کی ہر خوبصورتی کے ساتھ اظہارِ عشق کیا جاتا ہے، مجھے یہ کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہے کہ میرا سب سے زیادہ جذباتی عشق اور جذبات یا جسم میں جھرجھری پیدا کر دینے والا رومانس عوام کے ساتھ رہا ہے۔

سیاست اور عوام کے درمیاں کبھی نہ ختم ہونے والا بندھن جڑا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست میں آدمی ایک سیاسی کردار ہے اور ریاست یا مملکت ایک سیاسی تھیٹر ہے۔ میں بیس سال سے

www.bhutto.org

زائد ہنگامہ خیز برس اس سیاسی اسٹیج پر رہا ہوں، مجھے یقین ہے کہ لوگ اب بھی چاہتے ہیں کہ میں سیاست کے اسٹیج پر رہوں، لیکن اگر مجبوراً مجھے سیاسی اسٹیج سے علیحدہ ہونا پڑا تو میں تمہیں اپنے احساسات کا تحفہ دیتا ہوں، میرے مقابلے میں تم زیادہ بہتر طور پر جنگ لڑو گی۔ تمہاری تقاریر میری تقاریر کے مقابلے میں زیادہ فصیح و بلیغ ہونگی، تمہاری جدوجہد میں زیادہ توانائی اور جوانی کا جوش ہوگا، تمہارے اقدامات زیادہ جرأت مندانہ ہونگے۔ میں اس انتہائی مقدس مشن کی برکتیں تمہیں منتقل کرتا ہوں۔ میں اس جیل کی کوٹھری سے تمہیں کیا تحفہ دے سکتا ہوں جس میں سے میں اپنا ہاتھ بھی نہیں نکال سکتا، میں تمہیں عوام کا ہاتھ تحفے میں دیتا ہوں۔''

محترمہ بے نظیر بھٹو نے بڑی عقیدتمندی اور فرمانبرداری کے ساتھ تحفہ قبول کیا۔ محترمہ نے عظیم والد کے دیئے ہوئے تحفے کی بقاء اور وفا کی خاطر اپنی پوری زندگی عوام کی آزادی اور خوشحالی کی جدوجہد کے سپرد کردی۔ محترمہ کی بہادری، رہنمائی، وطن پرستی اور عوام دوستی کی لازوال داستان ان چند سطور و صفحات پر سمائی نہیں جاسکتی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو دنیا کے مدبر رہنماؤں میں شمار کی جاتی ہیں۔ ساری دنیا کے ممالک محترمہ کو اپنا مہمان بنا کر ان کے افکار سنتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ دختر مشرق کو کئی عالمی مدبر، ''دختر کائنات'' تصور کرتے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کیلئے محترمہ کی قیادت عطیہ خداوندی ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی اپنے پروگرام کے حوالے سے پاکستان میں حقیقی عوامی سیاست کی بانی ہے۔ پیپلز پارٹی نے ہی ملک میں پہلی بار عوامی حاکمیت اور سماجی برابری کے تصور کو مشتہر کر کے اسے مضبوط کیا ہے، اس میں ملک کے سارے عوام کو شریک کر کے اس تصور کے مستقبل کو پاکستان میں روشن اور محفوظ کردیا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی عوامی بیداری اور خدمت کے حوالے سے بھی بے مثال ریکارڈ کی مالک ہے۔ پیپلز پارٹی نے ہی عوام کو طاقت کا سرچشمہ قرار دے کر وطن کے مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں، طالب علموں، عام اور غریب آدمیوں اور خواتین کیلئے احترام اور عزت والا مقام مقرر کیا ہے۔ پیپلز پارٹی نے اپنے ہر دور میں ملکی خواہ بین الاقوامی سطح پر وطن پرستی، آزادی اور عوامی بھلائی پر مشتمل پالیسیاں اختیار کی ہیں اور انہیں متعارف کیا ہے۔ جہاں پاکستان پیپلز پارٹی کی وطن پرستی اور عوام دوستی کی داستان طویل ہے وہاں اس کے اپنے انقلابی خیالات، پالیسیوں اور فیصلوں کی خاطر قربانیاں دینے اور قیمتیں ادا کرنے کا قصہ بھی مختصر نہیں ہے۔

www.bhutto.org

کارکنوں کے حوالے سے پیپلز پارٹی پر نظر کرتے ہیں تو یہ پارٹی ہیروں کی کان نظر آتی ہے۔ پیپلز پارٹی کے کارکن صرف پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے نہیں بلکہ برصغیر اور دوسری دنیا کی پارٹیوں کے بہادر، مستقل مزاج، متحرک، مخلص کارکنوں کے شانہ بشانہ کھڑے محسوس ہوتے ہیں۔ پاکستان میں کسی بھی سیاسی پارٹی کے کارکنوں نے اپنی قیادت، پروگرام اور جمہوریت کیلئے اتنی قربانیاں نہیں دیں، جتنی پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے دی ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی داستان حوصلہ اور وفا کی داستان ہے، جدوجہد کے حوالے سے یہ داستانِ دار و رسن ہے۔ اس مختصر تحریر کا مقصد پاکستان پیپلز پارٹی، اس کی عظیم قیادتوں اور بہادر اور مجاہد کارکنوں کی داستان رقم کرنا نہیں ہے۔ اسٹڈی سرکل نے ان موضوعات پر الگ اور مخصوص پروگرام کرنے اور مواد شایع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس تحریر میں فی الحال صرف تنظیم کی طاقت کا مظاہرہ یعنی نظم و ضبط کی متعلق چند گزارشات کرنا مقصد ہے۔

ہمیں جہاں اپنی عظیم قیادت کی قربانیوں، جدوجہد اور صلاحیت پر فخر ہے جہاں ہمیں اپنے انمول ہیروں اور کارکنوں پر ناز ہے، جہاں اپنی پارٹی کی کامیابیوں اور روشن ماضی پر فخر ہے وہاں پر یہ اعتراف کرنے میں شرمندگی ہرگز محسوس نہیں کرنی چاہئے کہ نظم و ضبط کے حوالے سے ہم ہمیشہ اپنے نقادوں کی تنقید کے نشانے پر رہے ہیں۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہماری پارٹی میں نظم و ضبط نہیں ہے۔ نظم و ضبط پارٹی کا وہ عنصر ہے جس سے پارٹی میں زندگی کا احساس ہوتا ہے، جس سے پارٹی کی طاقت کا مظاہرہ ہوتا ہے، جس سے پارٹی میں غلط رویوں اور سیاسی بے راہروی اور بیگانگی کو روکا جاسکتا ہے، کیونکہ نظم و ضبط کا پہلا اور بنیادی اصول ہے پارٹی کے فیصلوں کو تسلیم کرنا اور دل و جان سے ان پر عمل کرنا۔ نظم و ضبط کو اگر مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو یہ کہنے میں کوئی غلطی نہیں کر رہے ہیں کہ پارٹی کے تمام کارکن دوست نظم و ضبط کے بہتر مثال ہیں، کیونکہ پارٹی کے فیصلوں کی بجا آوری ان کارکنوں کی طرح کسی پارٹی کے کارکنوں نے نہیں کی ہے، کون سی پارٹی کے کارکنوں نے نعرہ بلند کرتے ہوئے کوڑے برداشت کیے اور جیلیں کاٹی ہیں اور کون سی پارٹی کے کارکنوں نے نعرہ لگاتے ہوئے فخر سے سر بلند کرتے ہوئے سولیوں کو سجایا ہے؟ یہ پیپلز پارٹی کے کارکن ہیں جو جوانیاں زندان میں گزار کر اور بے پناہ اذیتیں برداشت کر کے بھی اپنی با مقصد، انقلابی اور جمہوری جدوجہد سے نہ دستبردار ہوئے ہیں، نہ تھکے ہیں، آج بھی ان کے پرجوش نعروں کی آواز آ

www.bhutto.org

رہی ہے کہ:

کہتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو،
بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے
منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے۔

کے حوالے سے مختصر بات چیت ہو رہی تھی کہ جن پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنا کامیابی سے مکمل کر کے بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں، ان باتوں میں سے چند یہ ہیں۔

وقت کی پابندی

انسان کو ساری زندگی میں وقت کی قدر کرنی چاہیے کہ گیا وقت لوٹ کے نہیں آتا۔ سیاست میں تو وقت کی بڑی ہی اہمیت ہے، وقت نکل جائے تو سیاسی پارٹی کیلئے اپنے نقصان کی تلافی کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ سیاسی کام اور وہ بھی سماج میں تبدیلی لانے جیسا کام تو وقت کی پابندی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ جلسہ، مظاہرہ، اجلاس اور دیگر پروگرام ہماری پارٹی کی زندگی کی ضرورت ہیں ان کے ذریعے ہی ہم اپنے کام سرانجام دیتے ہیں۔ ان موقعوں پر ہر حال میں وقت کی پابندی کرنی چاہیے۔ کئی موقعوں پر وقت کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے ہمیں میڈیا اور اپنے سیاسی مخالفین کے آگے شرمندہ ہونا پڑا ہے اور اس کے علاوہ بھی ہمیں کئی نقصانات اٹھانا پڑے ہیں وقت کی پابندی نہ کرنے سے۔ آیئے پارٹی کو باعزت اور سرگرمیوں کو بامقصد اور نتیجہ خیز بنانے کے لئے ہم خود بھی اور دوسرے ساتھیوں کو بھی وقت کا پابند بنائیں۔ دوستو یاد رکھئے کہ وقت کامیابی کا تاج انہی کے سر پر سجاتا ہے جو وقت کی قدر کرتے ہیں۔

تنظیمی اجلاس اور آداب مجلس

میں نے اپنی تحریر کے آغاز میں کہا ہے کہ تنظیم، عملی اور ذہنی ہم آہنگی کا نام ہے، اس کے بغیر لوگوں کے ایک ساتھ ہونے کو ہجوم تو کہا جا سکتا ہے لیکن تنظیم نہیں۔ ہمارے اجلاس یا خالص تنظیمی اجلاس کو بہتر، بامقصد اور حقیقی اجلاس تب ہی کہا جا سکتا ہے جب ہم اس میں ذہنی اور عملی ہم

www.bhutto.org

آہنگی اور دل کی گہری وابستگی کے ساتھ شریک ہوں۔

ہر سطح کے اجلاس کے آداب (Decorum) کا خیال رکھنا اور ان کی پابندی کرنا دل کی گہری وابستگی کے ساتھ شرکت کا ثبوت ہے۔ ہر سطح کے اجلاس کے شرکاء مخصوص ہوتے ہیں، جیسا کہ ایگزیکٹو کے اجلاس میں عہدیداران، صوبائی کونسل میں صوبائی کونسل کے اراکین اور سی۔ای۔سی میں مرکزی کمیٹی کے ممبران شریک ہوتے ہیں اور جنرل باڈی میں عام ورکر دوست شریک ہوتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اجلاس کو بامقصد بنانے کیلئے صرف وہ دوست اجلاس میں شریک ہوں جن کا اس اجلاس میں شرکت کا استحقاق بنتا ہے۔ اجلاس میں اجلاس کے طے شدہ ایجنڈا پر بولنا بھی تنظیمی اجلاس کیلئے لازمی ہے، ایسا کرنے سے وقت کے زیان سے بچا جاسکتا ہے بہتر فیصلے کیے جاسکتے ہیں۔

اجلاس کی صدارت کی کرسی کا لحاظ رکھنا اور اس کی ہدایت پر عمل رکھنا، اس کی اجازت سے ہی بولنا کسی دوست کی گفتگو کی درمیاں دخل نہ دینا بھی اجلاس کو بامقصد کرنے کیلئے لازم ہے کیونکہ یہ باتیں ہی اجلاس کے آداب ہیں۔

اجلاس کے آغاز میں تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ حاضری حیران کن ہوتی ہے اور مثالی حاضری سے اراکین کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اجلاس کے اختتام کے وقت حاضری بالکل کم ہو جاتی ہے، اکثر دوست اپنی تقریر کر کے چلے جاتے ہیں، کچھ دوست صاحب صدر کی اجازت کے بغیر اجلاس سے نکل جاتے ہیں، یہ بات پارٹی کی مفاد کے منافی اور آداب اجلاس کے خلاف ہے۔ شرکاء کو آغاز سے اختتام تک اجلاس میں رہنا چاہیے اور اگر دوران اجلاس جانا ہے تو صاحب صدر سے اجازت لینی چاہیے۔ آیئے اس بات کا بھی عہد کریں کہ ہر اجلاس میں آغاز سے اختتام تک بیٹھ کر اپنی محبوب پارٹی کی تنظیمی کارروائی اور امور میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کریں گے۔

تنقید اور خود احتسابی

طویل عمل پانے اور یادگار کامیابیاں حاصل کرنے والی ہر تحریک اور تنظیم میں تنقید اور خود احتسابی کا عمل جاری وساری رہتا ہے، اس لئے ہمارے مدبر قائد شہید ذوالفقار علی بھٹو نے

www.bhutto.org

کارکنوں کے نام ایک خط میں کہا تھا "آپ کو چاہیے کہ ہر وقت کام کا جائزہ لیتے رہیں اور پارٹی میں تنقید اور خود احتسابی کا عمل جاری رکھیں کیونکہ یہ عمل پارٹی کو سنوارے گا۔ مضبوط کریگا اور منظم کریگا۔ بقول ماؤزے تنگ پارٹی کے اندر تنقید ایک ایسا ہتھیار ہے جو پارٹی کی تنظیم کو مستحکم کرتا ہے۔"

تنقید اور توہین مختلف چیزیں ہیں پہلی بہتری، دوسری نقصان دہ ہے، اس لئے تنقید میں کبھی بھی توہین کا پہلو ظاہر نہیں ہونا چاہیے۔ تنقید میں عمل کا جائزہ ہونا چاہیے، قابل برداشت انداز اور لہجے میں نرمی ہونی چاہیے۔ توہین کے انداز میں ہونے والی تنقید انتشار کا باعث ہوتی ہے، اس سے سیاسی کام بہتر ہونے کی بجائے بے نتیجہ اور سلجھنے کی بجائے الجھتے ہیں۔ تنقید کا حق تسلیم کیا جانا چاہیے لیکن تنقید کے بہانے توہین اور ہتک کی اجازت ہرگز نہیں دینی چاہیے۔

اس بات کو دہرانے میں کوئی حرج نہیں کہ نظم وضبط اپنے روح کے مطابق تو ہماری پارٹی کے کارکنوں میں کمال حد تک موجود ہے مگر چند مذکورہ بالا باتیں اور کچھ دیگر باتیں جو ماحول کے مطابق پیدا ہوتی ہیں اور نظم وضبط کے دائرے میں آتی ہیں، ان کا فقدان نظر آتا ہے، اس فقدان پر قابو پانا ضروری ہے۔

دوستو، ساتھیو، کیا پاکستان پیپلز پارٹی کے پرچم تلے، قائد عوام شہید ذوالفقار علی بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت میں بے پناہ سیاسی، معاشی کامیابیاں حاصل کرنے والی پارٹی اور اذیتوں کے دور یا عبور کر کے آنے والے کارکنوں سے نظم وضبط کے دائرے میں آنے والی باتوں اور نکات کا احترام اور پابندی کی توقع کی جاسکتی ہے؟

اگر ہاں، تو آیئے مستقبل میں کامیابیاں حاصل کرنے کیلئے ملک کے سیاسی افق پر چھا جائیں اور اپنے فتح مند قدم اپنے محبوب قائد کی آخری آرام گاہ کی طرف لے چلیں۔

www.bhutto.org

ایک ہی راستہ

ریاست اور رعایا کے تعلق اور ترقی کے حوالے سے جمہوریت صدیوں کی سوچوں اور تجربوں کا ثمر ہے۔ سیاسی مفکرین اور انسان دوست دانشوروں نے جمہوریت کو ہی حکومت میں عوام کی شرکت کا نظام تسلیم کیا ہے۔ اسی لئے شہید ذوالفقار علی بھٹو نے بھی عوام کی آزادی اور خوشحالی کیلئے پارٹی بناتے وقت ہی اعلان کر دیا تھا کہ "جمہوریت ہماری سیاست ہے۔"

جمہوریت عوام کی حکومت، جمہوریت عوام کیلئے حکومت، جمہوریت عوام کے ذریعہ حکومت ہی ہوتی ہے، مگر ایسا نہیں ہے کہ کسی پارٹی کے انتخابات جیت کر حکومت بنانے کے ساتھ ہی ملک کے سب مسائل حل ہو جائیں گے اور عوام کی سب شکایات دور ہو جائیں گی، کیونکہ جمہوریت مسئلہ کا فوری حل نہیں بلکہ مسئلے کے حل کی سمت راستہ ہے، راہ ہے منزل نہیں، جمہوریت جدید طریقہ ہے انسانی آزادی اور خوشحالی حاصل کرنے کا۔

جمہوریت قائم ہوتے ہی مسائل حل ہو جائیں ایسا تو وہاں بھی نہیں ہوا جہاں آجکل مثالی جمہوریت قائم ہے، ان ممالک میں بھی جمہوریت کئی سالوں کا سفر کر کے موجودہ منزل تک پہنچی ہے، لیکن جمہوریت کا سفر ختم نہیں ہوا، کیونکہ ابھی دنیا مثالی دنیا نہیں بن سکی۔ جمہوریت بھی ایک بچہ کی طرح گرتی اور سنبھلتی ہوئی اپنا سفر طے کرتی ہے۔ جمہوریت جس نظام کو ہٹا کر خود قائم ہوتی ہے وہ نظام صدیوں پرانا، مخلوق خدا کے خون پر پل کر ہیبت ناک بن چکا ہوتا ہے، اس نظام کے محافظ بھی تمام تر قوت کے ساتھ پرانے نظام کا ساتھ دیتے ہیں اور جمہوریت کو آنے سے روکتے ہیں، اسی لئے جمہوریت کے آغاز میں جمہوریت میں خامیاں بھی نظر آتی ہیں اور نتیجہ خیز بھی نہیں لگتی لیکن اس صورت حال سے مایوس ہونے کے بجائے جمہوری جدوجہد کا تجزیہ کرتے ہوئے جدوجہد کو تیز کرنا چاہئے کیونکہ جمہوریت کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو بھی جمہوریت سے ہی دور کیا جا سکتا ہے۔ جمہوریت سے فیضیاب ہونے کیلئے مسلسل جمہوریت ضروری ہے۔

جمہوریت پسند دانشوروں اور رہنماؤں کی زبانی جمہوریت کی ثنا خوانی سنتے ہی ہم حیران ہو

www.bhutto.org

جاتے ہیں کہ یہ کون سی جمہوریت کی بات کی جارہی ہے؟ ہم نے تو جمہوریت کا یہ روشن چہرا کبھی نہیں دیکھا؟ ہمارے یہاں تو خوشحالی کے وہ سورج نظر نہیں آئے جن کو طلوع کرنے کی دعویٰ جمہوریت کرتی ہے، اور تو اور ہمارے یہاں تو خیال، فکر، اظہار کی وہ آزادی بھی نہیں آئی جو جمہوریت کی پہچان ہوا کرتی ہے۔ حالانکہ ہمارے ملک میں کئی حکومتیں جمہوری ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ ان خیالات کے ساتھ پھر مایوسی کے خیالات بھی ابھرتے ہیں، پھر سوال بھی کئے جاتے ہیں کہ ہمیں جمہوریت نے کیا دیا ہے؟ جس جمہوریت نے ہمیں کچھ نہیں دیا، جس نے ہماری زندگی نہیں بدلی، اس جمہوریت کیلئے قربانی دینے سے کیا حاصل؟

اس صورتحال پر سوالوں کا اٹھنا لازمی ہے لیکن تجزیہ کرنے سے پتہ چل جائیگا کہ اصل میں ہمارے یہاں جمہوریت کو قائم کرنے دیا ہی نہیں گیا۔ ہمارے یہاں بھٹو شہید کے اوائلی دور کے علاوہ جمہوریت صحیح معنی میں قائم ہی نہیں ہوئی۔ جمہوریت کے متعلق اٹھنے والے سوالات اس صورتحال کا نتیجہ ہیں جو جمہوریت دشمنوں کی سازشوں سے پیدا ہوئی، یہ سوالات جمہوریت کی راہ روکنے، جمہوریت کو غیر مؤثر، غیر مستحکم کرنے اور عوام کو جمہوریت سے مایوس کرنے کیلئے جمہوریت دشمن، مستقل حکمران طبقہ اور گروہوں کی طرف سے پیدا کئے گئے ہیں ورنہ ایسا نہیں ہے کہ جو سیاسی نظام کئی ملکوں میں عوامی زندگی کو بہتر بنا رہا ہے وہ ہمارے یہاں نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا۔

ہر انسان دوست فکر کی روح میں انسانی عظمتوں کے راستے بتائے گئے ہیں، مگر ان عظمتوں تک رسائی حاصل کرنے میں ان فکروں کے نافذ کرنے والوں کا کردار بنیادی اہمیت کا ہوتا ہے۔ جیسے انصاف، منصف پر منحصر ہوتا ہے ویسے ہی نظام بھی اپنے نگہبانوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ مقدس سے مقدس اور عظیم سے عظیم فکر اور نظریہ، مفاد پرستوں، اقربا پروروں، فکر کی روح کے منکروں، وقت کی تقاضاؤں سے منہ موڑ کر وقت گزارنے اور وقت سے عیاشی کا سامان پیدا کرنے والوں کے ہتھے چڑھ کر ماضی کے ٹھکرائی ہوئے نظریات اور افکار کی طرح ہوسکتا ہے۔

دنیا کے اکثر فکری اور ریاستی انقلابات پر نظر کرتے ہیں تو "گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" والی صورتحال نظر آتی ہے۔ انسان نے جہاں اپنی زندگی کو بہتر بنانے کیلئے حیرت انگیز کمالات دکھائے ہیں وہاں انسان کی اپنی تباہی میں بھی انسانی ہاتھ نظر آتے ہیں، اور اس تباہی کا

www.bhutto.org

سامان اکٹھا کرنے والے ہاتھ غیروں کے کم اپنوں کے زیادہ ہوتے ہیں۔ دور کیوں جائیں ہمارے زمانے کی عظیم طاقت روس کو ہی لیتے ہیں۔ جہاں ہتھوڑا اور کرانتی والا سرخ پرچم کریملن پر لہرا رہا تھا، وہ ماسکو دنیا کے کروڑوں انسانوں کی محبت کا مرکز تھا۔ سوویت روس لاکھوں لوگوں کی قربانیوں کا ثمر تھا۔ لیکن کیا ہوا جن انسانوں نے ایک خواب کو حقیقت بنا دیا پھر انہیں انسانوں نے حقیقت کو خواب میں تبدیل کر دیا۔ کل کا ماسکو آج کا ماضی بن گیا ہے، ایک حسین خواب بن گیا ہے جو کئی سالوں تک یاد رکھا جائے گا۔ روس کو منتشر کرنے اور ماسکو کو سرخ آسمان سے محروم کرنے کیلئے غیروں کی فوجیں آئیں نہ آسمان سے بارود برسا۔ اس عظیم مملکت کو اپنے نگہبانوں نے منتشر کر دیا، اس حیرت انگیز انقلاب کو اپنے طرفداروں نے طعنہ بنا دیا۔ شہید بھٹو روس کے اندرونی انتشار سے آگاہ تھے، انہیں انقلابی انتظامیہ کے غیر انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ تھا تب ہی تو انہوں نے پرسٹرویکا سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ "مارکسٹ معاشرہ نے خود اپنا طبقاتی ڈھانچہ تخلیق کر لیا ہے۔"

جمہوریت سے بھی مکمل فوائد اور نتائج حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ جمہوریت بھی حقیقی جمہوری ہاتھوں میں ہو۔ جمہوریت کیلئے ملکی ماحول اور عوام کا اثر رسوخ اور عملی شرکت بھی کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ پاکستان میں جموریت کیوں کامیاب نہیں ہو سکی؟ دیگر جمہوری ملکوں کی طرح یہاں پر جمہوریت بہتر نتائج کیوں نہیں دے سکتی؟ ان سوالات کا جواب ایک ہی ہے کہ پاکستان میں جمہوریت قائم ہونے کا موقعہ ہی نہیں دیا گیا۔ ہاں اگر کسی مختصر عرصے میں خاص طور پر شہید ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں جمہوریت قائم ہو کر آزادی سے کام کر سکی تو وہ ایسی یادیں چھوڑ گئی ہے کہ جس کے اثرات آج بھی محسوس کئے جا رہے ہیں۔ شہید بھٹو کا نام اور ملکی سیاست میں پیپلز پارٹی کی اہمیت، اسی مختصر سی لیکن حقیقی اور خود مختیار جمہوریت کا کارنامہ ہے۔ پاکستان کے قیام کے ساتھ جمہوریت کی راہ روکنے کی سازشوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ ملک میں موجود برائے نام جمہوریت کے خلاف اقدام کئے جاتے رہے اور آخر کار ایوب نے آمریت کر کے آنے والے کئی سالوں تک آمریت کے بار بار آنے کیلئے راستہ بنا دیا۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو نے صحیح کہا تھا کہ "مارشل لا نافذ کرنے کے وقت مارشل لائی حکمران کہتے ہیں کہ وہ ملک کو بحران سے نکالنے کیلئے آئے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ بحران کو مزید شدید کر کے

www.bhutto.org

چلے جاتے ہیں۔" جنرل ایوب نے بھی بحران کو شدید کر دیا، ادارے انتشار کے شکار ہو گئے، دانشوروں نے بلکل درست کہا ہے کہ قوموں کے نجات دہندہ بحران میں ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ پاکستان کے بحران نے بھی اپنی غیر معمولی قیادت کا ذوالفقار علی بھٹو کے نام سے تعارف کروایا۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو اپنے سارے دور میں جمہوریت کو نتیجہ خیز بنانے اور اس کے استحکام کیلئے کوشش کرتے رہے۔ شہید بھٹو کا یقین تھا کہ عوام کی معاشی حالت بہتر کئے بغیر جمہوریت بے معنی ہے۔

بھٹو شہید جانتا تھا کہ ملکی ترقی میں عوام کی شرکت اور ملکی وسائل کی بہتری میں استعمال کئے بغیر اور اجارہ داریوں کے خاتمہ کے سوائے جمہوریت کا مستقبل محفوظ نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا بھٹو صاحب نے جمہوریت کے ساتھ سوشلزم کے اصول بھی اپنانے کی بات کی۔ بھٹو شہید نے کہا کہ "موجودہ حالات کی جگہ ایک ایسے جمہوری اختیارات کے دور کا آغاز ہونا چاہیے جس میں پوری آبادی شریک ہو، نہ صرف شریک ہو بلکہ اسے بااختیار ہونے کا احساس بھی ہو، وہ اس پر فخر بھی کرے، اس کے ساتھ ساتھ بنیادی حقوق کو بحال کیا جائے اور عوام کو ایک ایسے سماجی برابری والے معاشرہ کیلئے متحرک کیا جائے جو عوام کی تمام خواہشوں کی تکمیل ہو اور تمام طاقت عوام کو منتقل کی جائے اور یہ سب کچھ جمہوریت میں ہی ممکن ہو سکتا ہے۔"

"جمہوریت ضروری ہے پر آخری منزل نہیں، جمہوریت کی جدوجہد میں اقتصادی مقاصد کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہی مقاصد پہلی حیثیت کے حامل ہیں، اقتصادی ترقی کے بغیر کوئی قوم بھی برائے نام جمہوریت سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ جمہوری آزادی ضروری ہے مگر اقتصادی مساوات اور انصاف بھی ضروری ہے۔ اقتصادی تبدیلیوں کے بغیر قومی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی اگر عوام کی غلامی کے خاتمے کی خواہش ہے تو جمہوریت کے ساتھ کشادہ دل سوشلزم بھی ضروری ہے۔"

"میرا ایمان ہے کہ اگر اقتصادی اور سماجی انصاف کی راہ کو نظر انداز کیا گیا تو نہ صرف پاکستان کی سالمیت کو خطرہ ہے بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہونا بھی یقینی ہے۔" (شہید بھٹو کا یہ تجزیہ مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے سے پہلے کا ہے۔)

سوشلزم کے حوالے سے شہید بھٹو پر تنقید بھٹو صاحب کے فکر سے لاعلمی یا پھر محض سیاسی

www.bhutto.org

دشمنی کا نتیجہ ہے۔ شہید بھٹو کا سوشلزم روس اور چین کے سوشلزم سے مختلف تھا۔ بھٹو صاحب سوشلزم کے ویسے حامی نہ تھے۔ ماسکو میں برف باری ہونے پر پاکستان میں اوورکوٹ پہن لیتے۔ بھٹو صاحب کی نظر میں ہر ملک میں سوشلزم اس ملک کے حالات کے مطابق نافذ کیا جاتا ہے۔ بھٹو شہید سوشلزم کے معاشی اصولوں کے حامی تھے اور انہیں پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے تھے۔ چین اور روس کے سوشلزم میں کم سے کم مذہب کے اعلانیہ تعلق کی گنجائش بھی نہ تھی جبکہ بھٹو صاحب کا سوشلزم مذہب سے متصادم نہ تھا۔ بھٹو شہید نے کہا کہ:

''ایک جگہ کے حالات دوسرے جگہ سے مختلف ہوتے ہیں اس لئے پاکستان میں نافذ ہونے والے سوشلزم کیلئے ضروری ہے کہ وہ پاکستان کے نظریہ حیات سے ہم آہنگ ہو اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے جمہوری ہو، کسی بھی طریقے سے بیرونی مداخلت کی گنجائش نہ ہو۔''

''اگر سوشلزم کی اسکینڈی نیون قسم ہو سکتی ہے تو کوئی سبب نہیں کہ سوشلزم کی پاکستانی قسم نہ ہو۔''

''اسلام اور سوشلزم کے اصول ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہیں، اسلام مساوات کی تعلیم دیتا ہے اور سوشلزم مساوات کے حاصل کرنے کا جدید طریقہ ہے۔ اسلام ہمارا دین ہے وہ پاکستان کی بنیاد ہے۔''

''ان ملکوں کے علاوہ جو انقلاب کی آگ میں سے گزر کر آئے ہیں ان میں سے کچھ ممالک ایسے بھی ہیں جن میں دستوری شہنشاہیت قائم ہے، جہاں پر تشدد آمیز تبدیلیوں کے بغیر سوشلسٹ تقاضاؤں کو بتدریج پورا کیا گیا ہے۔ سوشلزم کا اصول بنیادی طور پر دو باتوں پر منحصر ہے اول جدید سوشلزم کا بنیاد معروضی ہے۔ دوم سوشلسٹ طرز فکر دنیا کے ہر خطے میں ملک میں رائج اقتصادی اور سیاسی حالات سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔''

بھٹو صاحب نے سوشلزم کو مساوات حاصل کرنے کا جدید ذریعہ ہی سمجھا تھا۔ بھٹو صاحب نے جمہوریت کی روح کے مطابق جمہوریت کو نافذ کرنے اور اس میں سے عوام کو مستفیض کرنے کیلئے پاکستانی حالات اور معاشرے کے مطابق سوشلزم کے اصول کو اپنانے کی بات کی ہے۔ بھٹو صاحب نے کبھی بھی نہ خود کو کمیونسٹ رہنما بتایا نہ پاکستان کو کمیونسٹ ملک بنانے کی بات کی نہ پیپلز پارٹی نے ہی

www.bhutto.org

خود کو کمیونسٹ طرز کی پارٹی کے طور پر متعارف کروایا، سچ تو یہ ہے کہ اب جبکہ دنیا کی اکثر سوشلسٹ اور کمیونسٹ ریاستیں ہی اپنے پروگرام سے دستبردار ہوگئی ہیں، کچھ منتشر بھی ہوگئی ہیں تب پیپلز پارٹی اور شہید بھٹو پر سوشلزم کے حوالے سے تنقید اپنی پرانے اختلافات کی پیاس بجھانے اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں میں ذہنی انتشار پھیلانے کے سوائے کچھ بھی نہیں۔ یہ تنقید بھی پیپلز پارٹی پر حملہ آور ہونے والوں کے کئی مورچوں میں سے ایک مورچہ ہی ہے۔

قصہ مختصر کہ دولت کے ایک جگہ یعنی مخصوص گروہ یا افراد کے پاس جمع ہونے کا موقع فراہم کر کے، ترقی میں بھی مخصوص مفادات کو مدنظر رکھ کر اور وسائل پر خلق کے بجائے خاص لوگوں کو قابض کرنے سے جمہوریت اپنی روح کے مطابق قائم نہیں ہوسکتی۔ جمہوریت کی روح عوام کی شرکت اور عوام کی اقتصادی خوشحالی کا نام ہے۔

بھٹو صاحب نے ملکی سطح پر عوام کو بہتر بنانے اور انہیں بنیادی ضروریات فراہم کرنے کیلئے اقدام کئے لیکن بھٹو صاحب اپنے ملک کی پسماندگی کو عالمی صورتحال سے الگ کر کے نہیں دیکھتے تھے، ان کی دنیا کے پسماندہ قوموں اور انکی پسماندگی کے اسباب پر نگاہ تھی، وہ عالمی اجارہ داروں کے ارادوں اور غریب ممالک کے ساتھ جارحانہ سلوک کو بھی دیکھ رہے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ان عالمی اجارہ داروں کو کمزور کئے بغیر اور اپنے ملک کو ان کی غلامی سے نجات دیئے بغیر نہ جمہوریت قائم ہوسکے گی نہ قوم غربت کے چنگل سے نکل سکے گی۔ بھٹو صاحب نے اپنے عظیم مقصد کے خاطر جہاں ملک میں بہادرانہ فیصلے کئے وہاں بین الاقوامی سطح پر پسماندہ ملکوں کے اتحاد کیلئے بھی کوشاں رہے۔ عالمی اجارہ داروں اور ان کے ملکی گماشتوں کو بھٹو صاحب کی سرگرمیوں میں اپنی شکست نظر آتی تھی۔ اس لئے نہایت طاقتور اور گھناؤنی سازش کے ذریعہ شہید بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

جنرل ضیاء کا دور جمہوریت کے خلاف عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ جنرل ضیاء کو ملک کے عوام دشمن طبقات اور افراد کی حمایت بھی حاصل تھی اور عالمی اجارہ داروں کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اپنے ملک میں ہر لحاظ سے جمہوریت کی پاسداری کرنے والے حکمران جنرل ضیاء کے ساتھ تھے، خود کو جمہوریت کے عالمی علمبردار کہلانے والے ہر ملک، ہر چیز اور ہر اصول کو اپنی اجاداری قائم کرنے اور اس کو مضبوط کرنے کے حوالے سے دیکھتے ہیں، ان کی جمہوریت پسندی،

www.bhutto.org

آزاد خیالی اور ترقی پسندی بھی جنرل ضیاء کے مثبت نتائج کی طرح ہے۔ یہ جمہوریت کے عالمی چیمپئن اسلام پر بنیاد پرستی اور غیر جمہوری قدروں کے نام پہ کئی الزام لگاتے ہیں لیکن اپنا سارا زور مسلمانوں کی شخصی حکمتوں کے تحفظ پر صرف کرتے ہیں انہیں اپنی روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے دشمن صرف اسلامی جمہوری ملک نظر آتے ہیں۔ دوہرا معیار رکھنے والے نام نہاد عالمی جمہوری چیمپئن کسی بھی قدرتی وسائل سے مالا مال ملک میں جمہوریت کو مضبوط کرنے ہی نہیں دیتے کیونکہ اسکے حکم کے غلام صرف آمر اور غیر نمائندہ حکمران ہی ہو سکتے ہیں لیکن جمہوری، آزاد اور خودمختیار حقیقی محبِ وطن رہنما نہیں۔

بقول شہید ذوالفقار علی بھٹو "جمہوری روایات کی عدم موجودگی آمروں کے ظلم اور تشدد کو آسان بنا دیتی ہے"، جنرل ضیاء کے دور میں ظلم وتشدد آسان بھی تھا اور عام بھی۔ جنرل ضیاء کے ظلم و تشدد اور غیر قانونی توانین اور سزاؤں سے اس کا کام آسان ہوتا دکھائی نہں دے رہا تھا۔ اس کو یقین ہو چلا تھا کہ اس کے ظالمانہ منصوبوں کی تکمیل جناب بھٹو کی موجودگی میں نہیں ہو سکتی۔ بھٹو صاحب عوام کی پرجوش امیدوں کی علامت بن کر جیل سے بھی عوامی جدوجہد کی رہنمائی کر رہے تھے، حوصلہ عطا کر رہے تھے۔

عوام کے حوصلے اور امید کو توڑنے کیلئے ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا دیا گیا، ۴-اپریل ۱۹۷۹ء کو بھیانک رات میں اس منصوبے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کو حقیقی، بامقصد اور خودمختیار جمہوریت قائم کرنے کے جرم میں سولی پر لٹکایا گیا:

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

شہید ذوالفقار علی بھٹو شہادت سے پہلے ہی اذیتوں کا ایک زمانہ گزار کے مقتل تک پہنچے تھے، گرفتاری، مقدمہ کی کارروائی، جیل کی تنہائی، کال کوٹھری کے اداس دن اور طویل راتیں.....!!

لاہور ہائی کورٹ میں مقدمہ کی کارروائی بھی ایک صبر آزما دور تھا، ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مولوی مشتاق بھٹو دشمنی سے لبریز تھا، وہ شہید کی توہین کے بہانے تلاش کرتا تھا، ایک کارروائی کے دوران شہید بھٹو سے توہین آمیز انداز میں مخاطب ہو کر بولا: "آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ تاریخ کی

www.bhutto.org

طالب علم ہیں اور مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ آپ کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ آپ تاریخ ساز بھی ہیں۔"

مولوی مشتاق تو گمنامی کی غاروں میں کب کا کھو چکا لیکن وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ شہید بھٹو تاریخ کے طالب علم بھی تھے اور تاریخ ساز بھی۔ تب تو انہوں نے کہا تھا کہ میں تاریخ کے ہاتھوں مرنے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ فوج کے ہاتھوں مارا جاؤں:

ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں۔

حق پرستی کی خاطر قبولی ہوئی موت بھٹو صاحب کو شہادت کے روپ میں ابدی زندگی عطا کر گئی۔ بھٹو کل بھی زندہ تھا، آج بھی زندہ ہے اور آنے والے وقت میں بھی تاریخ کے ساتھ ساتھ زندگی کے حرے لوٹا رہے گا۔

جنرل ضیاء کا مقصد پاکستان میں جمہوریت کے بانی کے خاتمے کے ساتھ ساتھ آنے والے دور میں بھی جمہوریت کو سانس لینے کی مہلت نہ دینا تھا۔ اس لئے اس کے تشدد میں اور شدت آ گئی، سندھ اور پنجاب میں کئی نوجوان اصولوں اور اجتماعی آزادی اور خوشحالی کی خاطر سولیوں کو سجا کر پاکستان کی سیاسی تاریخ میں انمٹ نقش چھوڑ گئے۔ شاہراہوں اور گلیوں میں گولیوں کی آوازوں کی گونج سنائی دے رہی تھی، اسی گونج میں زندگیوں کے سینکڑوں چراغ گل ہو گئے، ہزاروں برزگوں اور نوجوانوں پر کوڑے برسائے گئے۔ لاکھوں لوگوں نے عمر کے حسین سال جیل کی اونچی دیواروں کے پیچھے گزار دیے۔ مرد تو مرد، خواتین اور معصوم بچے بھی ضیاء کے ظلم سے محفوظ نہ تھے۔ جنرل ضیاء نے اپنی آمریت کو طول دینے اور جمہوریت کا راستہ روکنے کیلئے نسل پرستی اور فرقہ واریت جیسے انسانیت دشمن جنونیت کو مضبوط اور عام کر دیا۔ نتیجہ میں ملک میں ہر طرف نفرت کی آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ جنرل ضیاء کی شروع کی ہوئی فرقہ واریت اور نسل پرستی آج ہر آمر کے ہاتھ کا مہلک ہتھیار ہے جسے کوئی بھی آمر استعمال کر کے جمہوریت کو زنجیریں پہنا سکتا ہے۔ جنرل ضیاء نے دنیا بھر

www.bhutto.org

کے آمروں کے بدترین تجربوں سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے جمہوریت کے مکمل خاتمے کی کوششیں کیں، مگر یہ وقت کی رفتار معتبر کرنے والے کا فیصلہ ہے کہ سچ اور انصاف کو وقتی طور پر خاموش تو کیا جا سکتا ہے لیکن اسے ختم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سچائی اور انصاف کی موجودگی ہی زندگی اور اس کی حقیقتوں کے رواں دواں ہونے کا ثبوت ہے۔

تاریخ نے خود کو دہرایا اور شہید ذوالفقار علی بھٹو کی پیاری بیٹی ملک کی غیر معمولی قائد بن کر سامنے آئیں۔ انہوں نے اپنے والد کے مقدس مشن اور خوابوں کی تعبیر کیلئے عوام کی لازوال جمہوری جدوجہد کی رہنمائی کی۔ اس نے شہید بھٹو کے نقش قدم پر چلتی ہوئی ملک کے قصبہ قصبہ شہر شہر جا کر جمہوریت کے قیام کی جدوجہد کیلئے عوام کو بیدار اور متحد کیا۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو کے قتل، طویل آمریتی اذیتوں اور محترمہ بینظیر بھٹو کی شاندار عوامی جمہوری جدوجہد کے نتیجہ میں ایک خودمختیار اور حقیقی جمہوریت قائم ہو سکتی تھی مگر جمہوریت کے دشمن آٹھویں ترمیم کی صورت میں جمہوریت کے خلاف ایک طاقتور سازش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آٹھویں ترمیم کی تلوار جمہوریت کی اکڑی ہوئی ہر گردن کی شہ رگ کاٹنے کیلئے وجود میں لائی گئی تھی۔

پاکستان میں انتخابات بھی ہوئے پیپلز پارٹی اکثریت سے جیت کر بھی آ گئی مگر اقتدار عوام کے حوالے کرنے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ عوام اور ملک جمہوریت کا تقاضا کر رہے تھے۔ حکمران اور جمہوریت کے دشمن، آنے والی جمہوریت کو کمزور اور محدود کرنے کے جتن کر رہے تھے۔ دو ہی راستے تھے، ایک تصادم اور ایک دوسری طویل جمہوری جدوجہد کا راستہ، دوسرا مفاہمت کا راستہ، محدود ہی سہی مگر عوام کو طویل اذیتوں سے آزاد کرانے کی خاطر ہر حال میں جمہوریت قائم کرنے کا راستہ۔ اقتدار محترمہ کے حوالے کیا گیا۔ یہ جمہوریت طویل آمریت کے بعد قائم ہوئی تھی، اذیتوں کے سبب عوام بے حال تھے، ان کی آنکھیں اور امیدیں محترمہ میں ٹکی ہوئی تھیں، عوام کو یقین تھا کہ محترمہ ہی ان کی مشکلاتوں کا مداوا کریں گی، محترمہ ہی ملک کو بحرانوں کے بھنور سے نکالیں گی۔ محترمہ کو عوام کی اذیت ناک زندگی، افتشار، مایوسی، بیروزگاری، مہنگائی، ملک کا خالی خزانہ اور جمہوری روایات سے طویل انحرافی کے سبب ملک میں بھڑکنے والی تشدد اور نفرتوں کی آگ ورثہ میں ملی۔

www.bhutto.org

ستار طاہر کے الفاظ میں کہ:

''محترمہ بینظیر بھٹو کو پاکستان کی قیادت ۱۹۸۸ء میں ملی تو اس وقت کا پاکستان ۱۹۷۰ء کے پاکستان سے بھی زیادہ خستہ اور کمزور حالت میں ہے جب جناب بھٹو نے ملک کی قیادت سنبھالی تھی۔ بہرحال ایک عظیم چیلنج ہے، جس کا سامنا بینظیر بھٹو کو کرنا پڑ رہا ہے۔''

محترمہ نے یہ چیلنج قبول کیا اور ان مخصوص حالات میں بھی عوام کی خوشحالی اور ان کی زندگی بہتر اور آسان بنانے کیلئے کئی اقدام کئے۔ لیکن وہ اپنے پروگرام اور جمہوری خواہشات کے مطابق عوام اور ملک کو وہ کچھ نہیں دے پا رہی تھیں جن کا ملک اور عوام مطالبہ کر رہے تھے، محترمہ نے اپنے اقتدار کے دوران غیر جمہوری بااثر افراد اور گروہوں کے رکاوٹ بننے کے واقعات کئی بار بتائے ہیں کہ کس طرح عوام کی منتخب وزیراعظم کو ناکام بنانے کیلئے سازشیں کی جاتی تھیں۔ کس طرح جمہوریت کو محدود کیا جا رہا تھا، کس طرح جمہوریت کو بے اثر کر کے عوام کو جمہوریت سے مایوس کیا جا رہا تھا۔

محترمہ بینظیر بھٹو کو حالات کا ادارک تھا۔ محترمہ کو اپنے عظیم والد کی باتیں یاد تھیں کہ:

''تم بھی تاریخ سازی کر رہی ہو۔ تمہارے گرد آگ جلادی گئی ہے اور یہ آگ ایک بے رحم جنتا نے جلائی ہے، یہ آگ تباہ کن اور ہولناک ہے۔ تم میں اور اندرا گاندھی میں ایک شے مشترک ہے کہ تم دونوں یکساں طور پر بہادر ہو، تم دونوں فولاد کی بنی ہوئی ہو یعنی تم دونوں میں قوت ارادی فولادی نوعیت کی ہے لیکن تمہاری صلاحیت اور ذہانت تمہیں کہاں لے جائے گی، عام طور پر تو صلاحیت اور ذہانت تمہیں اعلیٰ ترین مقام تک پہنچائے گی۔ لیکن ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں ذہانت اور صلاحیت ایک نقص شمار ہوتی ہے اور دم گھوٹنے والی معمولی قسم کی ذہانت ایک اثاثہ شمار کی جاتی ہے۔''

ممکن ہے کہ بھٹو کی بہادر اور باشعور بیٹی بے سروسامانی اور سازشوں کے باوجود مشکلات پر قابو پالیتی، جمہوریت اور جمہوریت پر عوام کے اعتماد کو مستحکم کر جاتی مگر محترمہ اور جمہوریت سے خوفزدہ مخالفوں نے انہیں اپنی آئینی مدت پوری کرنے کا موقع نہیں دیا اور ایک بار پھر مختصر مدت والی جمہوریت کا خاتمہ کر دیا گیا۔

پیپلز پارٹی سے پہلے دور کے بعد بھی جمہوریت کے نام پر حکومتیں کی گئیں لیکن ان کا بھی

www.bhutto.org

وہی حشر کیا گیا جو حقیقی جمہوریت کا ہوا۔ ملک کے اندرونی اور بیرونی حالات طویل آمریت کی اجازت نہیں دیتے تو مستقل حکمران طبقے تھوڑے عرصہ کیلئے حقیقی عوامی نمائندوں کو بھی برداشت کر لیتے ہیں لیکن زیادہ تر اپنی بنائی ہوئی پارٹی اور اپنے کمال فن سے لائی ہوئی اکثریت کے ذریعہ ہی اپنی جمہوریت قائم کی جاتی ہے، ایسی جمہوریت قائم کر کے حقیقی جمہوریت کا راستہ روکنے کی سازش کی جاتی ہے، ایسی جمہوریت کے ذریعہ سے ایسے فیصلے اور قوانین نافذ کئے جاتے ہیں، جن سے جمہوریت کا راستہ روکا جاتا ہے، عوام کو جمہوریت سے بدظن کیا جاتا ہے، سیاستدانوں پر سے عوام کا اعتماد ختم کیا جاتا ہے، سیاسی بیزاری اور نظریاتی بیگانگی کی فضا قائم کی جاتی ہے۔ لیکن مستقل حکمرانوں کی لائی ہوئی جمہوریت کو بھی زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کیا جاتا کیونکہ جمہوریت بہرحال جمہوریت ہوتی ہے اور ہر جمہوریت کو دیر سویر اپنے ہونے کا احساس ہو جاتا ہے اور کسی نہ کسی لمحہ وہ اپنی جھلک دکھانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ جھلک عوامی حاکمیت کے دشمنوں کی نیندیں اڑا دیتی ہے اور پھر نتیجہ وہی کہ جمہوریت کے خاتمہ کا اعلان۔

جمہوریت کا راستہ روکنے کیلئے اکثر الزامات، تحقیقات اور احکامات کا سہارا لیا جاتا ہے جمہوریت کے خاتمے کے اعلان کے ساتھ ہی الزامات کی ایک لمبی فہرست پڑھی جاتی ہے، اس فہرست کے اکثر و بیشتر نکات ہر جمہوریت کے خاتمے پر دھرائے جاتے ہیں۔ جمہوریت جتنی حقیقی ہوگی، جمہوری رہنما جتنا مقبول اور مضبوط ہوگا الزامات اتنے ہی سنگین ہوتے۔ مضبوط اور مقبول جمہوری رہنما کے خلاف تو ہر نئے سورج کے ساتھ نیا الزام ہوتا ہے۔ ہر الزام کی تشہیر اور تحقیقات کا قصہ بڑی دھوم کی ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں شہید ذوالفقار علی بھٹو اور محترمہ بینظیر بھٹو سب سے زیادہ مقبول اور مضبوط سیاسی رہنما ہیں تو ان کے خلاف بھی الزامات اور ان کی تشہیر بھی عوام کے سامنے ہے۔ شہید بھٹو کو تختہ دار تک لے جایا گیا اور محترمہ کو ایک عدالت سے دوسری عدالت، ایک شہر سے دوسرے شہر کا مسلسل سفر، جلاوطنی اور غیر ملکی کردار کشی کی مہم کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ محترمہ کے خلاف بیانات اور الزامات کا سلسلہ آج بھی جاری ہے جب کہ انہیں ملک بدر ہونے پر مجبور بھی کر دیا گیا ہے۔

جمہوریت محض عوام کے منتخب نمائندوں کے اسمبلی میں بیٹھنے کا نام نہیں ہے۔ جمہوریت

www.bhutto.org

نام ہے عوام کی حاکمیت کو تسلیم کرنے، حکمرانی میں نمائندگی کے ساتھ ساتھ شرکت کو یقینی بنانے، ملک کے تمام وسائل عوام کی زندگی کو بہتر اور آسان بنانے پر صرف کرنے اور ملک کو اقوام عالم میں آزاد اور خودمختیار خارجہ پالیسی کے حوالے سے باعزت مقام دلانے کا۔ ملک میں جمہوریت کے نام پر کئی سال گزارنے کے باوجود آج ہمارا ملک کہاں کھڑا ہے؟ نہ اقوام عالم میں آزاد خودمختیار حیثیت کا مالک ہے نہ اپنے ملک کے عوام کی زندگی کو آسان اور بہتر بنانے کی دعوا کر سکتا ہے۔ عوام کی اذیت ناک زندگی کا ذکر ہمارے روزمرہ کا معمول بن گیا ہے یہ ذکر روزانہ کتنے ہی محب وطن اور حساس انسانوں کو خون کے آنسو رلاتا ہے۔ ان آنسوؤں اور سرد آہوں کے درمیاں ہر باشعور شہری سوچتا ہے کہ ان افسردگیوں اور اذیتوں سے نجات کب ملے گی؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ہے کہ ایک خودمختیار، حقیقی اور مسلسل جمہوریت کے قیام کے بعد۔

آج دنیا کے کئی ممالک اپنے مسائل حل کرنے کے سلسلے میں جمہوریت سے مستفیض ہو رہے ہیں اور وہ اپنے لئے آسان اور بہتر زندگی حاصل کرنے کی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ جمہوریت سے ہم بھی مستفیض ہو سکتے تھے۔ اب بھی ہو سکتے ہیں اگر ایک مثالی جمہوریت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

پاکستان میں حقیقی جمہوریت قائم ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں مسلسل جمہوریت دشمن سازشوں نے جمہوریت کی راہ میں بڑی رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کیلئے انسانی آزادی، بنیادی حقوق کی بحالی، بہتر زندگی اور آنے والی نسلوں کے روشن مستقبل کی لگن ضروری ہے۔ یہ یقین کر لینا چاہیے کہ جتنی مضبوط رکاوٹیں اور جتنا طویل غیر جمہوری دور ہے اتنا ہی طاقتور ارادہ اور عمل چاہیے جمہوریت قائم کرنے کیلئے۔

ہمارا ملک مکمل تعلیم یافتہ ملک نہیں ہے۔ ہماری اکثریت ان پڑھ اور دیہاتوں اور قصبوں میں رہنے والی ہے۔ یہ انتہائی غربت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ یہ اکثریت اپنا فیصلہ تو دے سکتی ہے مگر جمہوریت کی حفاظت کرنے اور شرکت کرنے کے شعور سے ناواقف ہے ہمیں اس اکثریت کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا ہوگا۔ اس اکثریت کو شعوری طور پر جمہوری سفر میں اپنے ساتھ شریک کرنا ہوگا۔

مزدور طبقہ جدوجہد کا شعور رکھتا ہے اور اتحاد کا مفہوم سمجھتا ہے۔ یہ گروہ جمہوریت کے قیام

www.bhutto.org

وبقا کیلئے اہم کردار ادا کرسکتا ہے لیکن ہمارے یہاں عرصہ ہوا حقیقی ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے خاتمے کے بعد اب مزدوروں کو فرقوں، زبانوں اور علاقوں کی بنیاد پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہمیں ایک بار جمہوریت کی خاطر اور سماج میں بہتر تبدیلی لانے کیلئے مزدوروں، محنت کشوں کو گروہی مفادات اور تضادات سے نکال کر صحت مند ٹریڈ یونین سرگرمیوں اور سیاسی جدوجہد کیلئے منظم و مستحکم کرنا ہوگا۔

کتنا ظلم ہے اس ملک میں کہ یہاں وقت بوقت ایک جرنیل تو سیاست کے میدان کا چیمپئن بنا رہتا ہے مگر طالب علم جو کہ ہمارے ملک کے مستقبل میں کردار ادا کرنے والے فرد ہیں انہیں سیاست سے دور رکھنے کے جتن کئے جاتے ہیں۔ نوجوان ہر انقلاب کے روح رواں ہیں ہمیں چاہیے کہ طالب علموں کو ان کے تعلیمی اور تدریسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اپنے ملک میں ہونے والی تبدیلیوں اور جدوجہد سے آگاہ کرتے رہیں اور ان کے مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں اپنی جدوجہد میں شریک کریں۔

خواتین ملک کی آبادی کا بڑا حصہ ہیں لیکن انہیں کوئی بڑا یا اہم کردار ادا کرنے کی نہ اجازت دی گئی ہے نہ انہیں تیار کیا گیا ہے۔ ہمارے اکثر علاقوں میں تو خواتین انتہائی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کردی گئیں ہیں۔ کوئی ملک اور سماج خواتین کی بہتر شرکت کے بغیر ترقی نہیں کرسکتا۔ ہمیں اپنی خواتین کو ان کے اپنے حالات کے مطابق منظم اور مستحکم کر کے جمہوری جدوجہد میں حصہ دار بنانا چاہیے۔ جمہوریت کے قیام، اس کی بقا اور اسے نتیجہ خیز بنانے کیلئے مسلسل سیاسی جدوجہد کرنے کے ساتھ ملک کے تمام طبقات کو متحد اور سرگرم کرنا سیاسی پارٹیوں کا کام ہے کیونکہ سیاسی پارٹیوں کی موجودگی ہی جمہوریت کی موجودگی کی دلیل ہے مگر بدقسمتی سے پاکستان کے قیام کے فوراً بعد ہی ملک کی سیاسی پارٹیوں کو منتشر اور غیر مؤثر بنانے کی کارروائیاں شروع کی گئیں۔ تمام غیر نمائندہ حکمرانوں نے سیاسی پارٹیوں کو کمزور اور منتشر کیا۔ پارٹیوں کو توڑنے اور کمزور کرنے کا آغاز ہی پاکستان کی بانی پارٹی سے کیا گیا۔ ہمارے مستقل حکمران گروہ نے ملک کی حقیقی سیاسی پارٹیوں کو تسلیم کرنے کے بجائے انہیں توڑنے اور ختم کرنے کے پروگرام پر عمل کیا ان کے مقابلے میں ایک ہی دن میں اپنی پارٹی بنانے اور اسے اقتدار حوالے کرنے کا تجربہ کیا۔ ایک رات میں بنائی ہوئی پارٹی ملک اور قوم کو کیا دے سکتی تھی؟ ہمارے مستقل حکمران طبقوں نے اکثر اپنے من پسند افراد کو بھی ملک کے مستقبل کا مالک

www.bhutto.org

بنا کر اپنے مخصوص مفادات حاصل کیے، پارٹیوں کی اجتماعی طاقت کے مقابلے میں ایک غیر نمائندہ اور غیر سیاسی شخص ملک کو کیا دے سکتا تھا؟ مستقل حکمران طبقوں کی ان مفاد پرستانہ کارروائیوں نے ملک کو بحران کے سوائے کچھ نہیں دیا۔ جمہوریت کیلئے لازمی ہے کہ تمام سیاسی پارٹیوں کے وجود کو تسلیم کر کے انہیں سیاسی کام کرنے کی مکمل آزادی دی جائے۔ یہ فیصلہ عوام پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ فیصلہ کریں کہ کس پارٹی کو عمل میں رہنا چاہیے اور کس پارٹی کو ماضی کے تذکروں کا حصہ بن جانا چاہیے۔ قصہ مختصر کہ جہاں پورے ملک کے اداروں میں جمہوریت کے خلاف سازشیں کی جاتی ہوں وہاں پورے ملک کے عوام کو بھی متحد و منظم کر کے جمہوری جدوجہد میں شامل کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔

عوام جمہوریت چاہتے ہیں مگر انہیں جمہوریت سے مایوس کیا گیا ہے۔ عوام سمجھنے لگے ہیں کہ جہاں ایک دو حلقوں کے نتائج نہیں بلکہ پورے کے پورے انتخابات چرائے جاتے ہوں وہاں عوام کی رائے اور فیصلے کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟ جہاں کسی ایک دو قوانین کی خلاف ورزی نہیں بلکہ پورے آئین کو معمولی کتاب قرار دیکر پھاڑ دینے کی بات کی جاتی ہو، جہاں آئین کو معطل کرنا سیاسی نظام کا معمول بن گیا ہو وہاں جمہوری جدوجہد کی کیا معنی؟ کیا فائدہ؟

یہ سچ ہے کہ عوام کے خدشات حقیقت پر مبنی ہیں، ملک کے سوچنے والے افراد کے تجزیے بھی درست ہیں لیکن یہ ہرگز درست نہیں ہو سکتا کہ ہم ملک کے غیر جمہوری حکمرانوں کی سازشوں کا شکار بن کر جمہوریت سے مایوس ہو کر بدترین سماجی و سیاسی زندگی کے عادی بن جائیں۔ صرف اپنی شخصی اور خاندانی زندگی تک محدود رہ جائیں۔ ملک و قوم سے لاتعلق ہو جائیں۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی پیاری بیٹی سے کہا تھا: "ہمت کا زوال تہذیب کے زوال کی پہلی علامت ہے۔"

ہمیں مایوسی نہیں ہونا چاہیے، ہمیں اپنے اور اپنی آئندہ نسلوں کے بہتر مستقبل اور بہتے ہوئے حال کی خاطر جمہوری جدوجہد کو تیز کرنا چاہیے۔ جمہوریت سے بہتر نتیجہ حاصل کرنے کیلئے ایک مسلسل جمہوری نظام اور حقیقی خودمختیار جمہوریت کے قیام کیلئے لازوال جدوجہد کیلئے خود کو تیار کریں۔ جمہوریت کی نگہبانی کیلئے انسان دوستی اور حب الوطنی کے نور سے منور آنکھوں کو منتخب کریں۔ جمہوریت کو مستحکم اور مؤثر کرنے کیلئے ہر دور کے آمروں سے مقابلہ کرنے والے ہاتھوں کو اور مضبوط کریں۔

www.bhutto.org

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ آج جمہوری جدوجہد ہی انقلابی جدوجہد ہے۔ آج کے مسائل کا حل جمہوریت سے ہی جڑا ہے۔ تمام ملکی سیاسی مسائل کے حل کا ایک ہی راستہ ہے۔ مسلسل، خودمختیار اور مکمل جمہوریت کا راستہ اور آخر میں ہمیں اپنے عظیم قائد کا یہ مشورہ بھی یاد کرنا چاہیے کہ:

''قومیں اُلٹے پاؤں واپس نہیں آیا کرتی ہیں۔ قومیں یا تو ترقی کرتی ہیں یا پھر دھماکے کے ساتھ انحطاط کا شکار ہو جاتی ہیں اور یا خاموشی کے ساتھ رو بہ زوال ہو جاتی ہیں۔''

www.bhutto.org

بھٹو کے خطابات

www.bhutto.org

www.bhutto.org

ہر ایک دروازہ کھٹکھٹاؤ!

پاکستان پیپلز پارٹی کا پہلا اور سب سے مقدم اصول یہ ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے۔ ہم نے اسلام کیلئے اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ ہم اس کے مقصد کی خاطر ہمہ وقت قربانی دینے کیلئے تیار دیکھے گئے ہیں۔ پاکستان اس لئے وجود میں آیا، کیونکہ ہم سب مسلمان ہیں۔ اگر ہم مسلمان نہیں ہوتے تو پاکستان کبھی وجود میں نہیں آتا۔ اور یہ ملک بنانے کی بھی کوئی ضرورت پیش نہ آتی۔ یہ بات اس پس منظر کے خلاف ہے کہ ہماری پارٹی کا اولین اصول یہ ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے، ہم بیک وقت یہ بھی کہتے ہیں کہ جمہوریت ہمارا سیاسی طریق کار ہے، کیونکہ جمہوریت عوامی حکومت بنانے کے سلسلہ میں رہنمائی کرتی ہے۔ جمہوریت میں عوام کی آواز پر لبیک کہا جاتا ہے۔ کسی حکومت کو بنانے یا ہٹانے میں عوام کو رائے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ہمارا تیسرا اصول یہ ہے کہ سوشلزم اقتصادیات اور اقتصادی نظام ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس 'سوشلزم' لفظ کا کتنا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے! کس لئے؟ میں آپ کو بتاؤں کہ صرف پاکستان میں ہی ایسا پروپیگنڈہ چلایا جارہا ہے۔ سوشلزم کے فروغ کیلئے برطانیہ جیسے ملک میں بھی جدوجہد جاری ہے۔ لیکن وہاں پر تو اسے خلاف مذہب بیان نہیں کیا جاتا۔ وہاں پر جو لوگ سوشلزم کے خلاف ہیں، انہوں نے تو کبھی نہیں کہا کہ یہ عیسائیت کے خلاف ہے!

یہ واقعہ دنیا میں کسی بھی جگہ رونما نہیں ہوا کہ سوشلزم کو مذہب سے متصادم ہونے کا الزام دے کر تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہو۔ اسلام میں ہمیں جمہوریت حاصل ہے۔ اگر اسلام میں جمہوریت میسر نہیں ہوتی تو آپ کبھی بھی اس کیلئے جدوجہد نہ کرتے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ اسلام جمہوریت کی بنیاد ہے اور جمہوریت انتہا تک اسلام کی جڑوں میں موجود ہے۔ اس بات کی پیروی کی جاتی ہے کہ جمہوریت خلاف اسلام نہیں ہے، لیکن جب سوشلزم کی بات کی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تو ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ 'سوشلزم' ایک انگریزی اصطلاح ہے، 'ڈیموکریسی' کی طرح۔ جسے ہم 'جمہوریت' کہتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی جمہوریت کے خلاف نہیں ہے۔ اس طرح 'سوشلزم' کے معنی ہمارے زبان میں ''مساوات'' ہے۔ تو ہم 'مساوات' کی مخالفت کیوں کریں؟ ''وہ'' مساوات کیوں نہیں چاہتے۔ کیا

www.bhutto.org

اس لئے کہ یہ اسلام کے خلاف ہے؟ اگر جمہوریت خلاف اسلام نہیں ہے تو ''مساوات'' بھی نہیں ہے۔

میرے بھائیو، میری بہنو! جیسا کہ کل میں نے آپ کو بتایا تھا کہ کوئی بھی مساوات کو ملک میں نافذ ہونے سے روک نہیں سکتا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی، میرے ساتھی اور میں بذات خود آپ کے ساتھ مضبوطی سے کھڑے رہیں گے۔ جب تک ہم ملک سے مفلسی اور غربت کو مکمل طرح جڑوں سے اکھاڑ کر باہر نہیں پھینکتے۔ ہم اپنی جدوجہد میں کسی جگہ پر نہیں رکیں گے۔ جہاں تک میری بات ہے، تو میں ہر ایک قربانی کیلئے تیار ہوں۔ جو مقصد ہمارے سامنے ہے، اسے خیال میں لاتا ہوں تو یہ بات مجھے بہت چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔

ہماری جدوجہد اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ ایک حق اور سچ کی جدوجہد ہے، ایک تاریخ ساز جدوجہد۔ اگر میں چاہتا تو اقتدار سے چمٹا ہوا ہوتا، دوسروں کی طرح، جو کہ آپ کا خون چوستے ہیں، لیکن میں اس کے خلاف ہوں۔ میں پاکستان میں انصاف چاہتا ہوں۔ میں پاکستان سے سارے استحصال کا خاتمہ چاہتا ہوں، وہ چیز میرے لئے کیونکر اچھی ہو سکتی ہے کہ میں اپنے لوگوں کو ستاؤں اور ان کا استحصال کروں۔ اگر مجھے اپنی قوم اپنے ملک کی خدمت کرنی ہے تو مجھے یہ کام صاف ضمیر کے ساتھ کرنا چاہیے۔ ورنہ سیاست میں رہنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ میں ان کا طرفدار کیوں بنوں جو کہ یہ ناانصافیاں کرتے ہیں۔ میں صراط مستقیم پر چلوں گا۔ اگر میں ان کی حمایت کرتا تو ان کے استحصال کی گرفت مزید مضبوط ہو سکتی تھی۔ لیکن میں نے ایسے عمل سے کراہت محسوس کی۔ مجھے یہ نہیں چاہیے تھا، کیونکہ وہ نظام پاکستان کے عوام کے خلاف تھا۔ میں کسی عوام مخالف نظام یا عوام مخالف حکومت کی حمایت نہیں کر سکتا۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمیں اس وقت مذہب کو کمزور کرنے کا الزام دیا جاتا ہے۔ جب ہم اپنے بچوں کیلئے اسکول، مزدوروں کے حقوق کی بحالی اور ایک ایسے اقتصادی نظام کا مطالبہ کرتے ہیں، جس کے تحت یہ ملک خوشحال ہو سکتا ہے۔ ہم اپنے دین کو کمزور نہیں کر رہے ہیں اور نہ ہی یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ ہم صرف پاکستان کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔

www.bhutto.org

پاکستان مضبوط کیسے ہوگا؟ یہ مضبوط اس وقت ہوگا، جب اس کے مزدور اور طلباء مضبوط ہوں گے۔ اگر عوام کی اکثریت غریب ہے، اگر عوام کی اکثریت بھوکوں مر رہی ہے، اگر وہ کمزور ہے، تو پاکستان کیسے مضبوط ہو سکتا ہے؟ اس پاکستان کا آخر مطلب کیا ہے؟ پاکستان کا مطلب پاکستانی عوام ہیں۔ اگر پاکستانی عوام کمزور ہیں، تو پاکستان کسی بھی طور مضبوط نہیں بن سکتا۔ ہم اپنے ملک کو مضبوط بنانا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے ملک اور مذہب کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر دکھ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، انہیں کافر قرار دیا جاتا ہے۔ کیا دنیا میں کافروں کی کوئی کمی ہے؟ اگر ہمارے مخالفین کافروں کے کے ساتھ لڑنا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ جائیں اور انہیں اسرائیل اور بھارت میں تلاش کریں۔

ہم مسلسل جمہوریت کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں، لیکن جمہوریت تن تنہا کام نہیں کر سکتی۔ ہم یقیناً جمہوریت چاہتے ہیں، اور اس کیلئے جہد مسلسل میں معروف رہے ہیں اور ہم نے آمریت کا سامنا کیا ہے، اس کے خلاف لڑے ہیں، مگر میں یہ بات بالکل واضح کرنا چاہتا ہوں کہ صرف جمہوریت ہی کافی نہیں ہے، ہم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ اقتصادی نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہیں لائی جاتیں۔

یہ پاکستان پیپلز پارٹی کیلئے وقت ہے، کہ اپنی جڑوں کو مضبوط کرے۔ آپ کو اس کی جڑوں کو مضبوط کرنا ہے۔ یہ آپ کی پارٹی ہے۔ یہ آپ کیلئے بنائی گئی ہے۔ اس پارٹی کے نام کا مطلب ہی یہی ہے کہ یہ پاکستانی عوام سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ میری پارٹی نہیں ہے، نہ ہی کسی فرد واحد کی پارٹی ہے، اس کا واسطہ سب سے ہے۔ یہ کوئی امیر جماعت نہیں ہے۔ جماعت اسلامی اور ایوب خان کی مسلم لیگ، جس کے پاس تیرہ ملین روپے تھے، اس کے برعکس ہمارے پاس کوئی دولت موجود نہیں ہے۔ لیکن ہماری دولت یہ ہے کہ ہم آپ کو مضبوط کریں اور آپ کو طاقت دیں۔ یہی وہ چیز ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ وقت آچکا ہے کہ آپ اپنی پارٹی کو مضبوط کریں۔ اس کیلئے آپ کو اس پروپیگنڈہ کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس کا مقابلہ کرنا پڑے گا کہ آپ کی پارٹی آپ کو اسلام سے دور لے جائے گی۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ ہر ایک دروازے پر جائیں، لوگوں سے ملیں انہیں سیاسی طور پر تربیت دیں اور باطل پروپیگنڈہ کا جواب دیں۔ سیاسی پارٹیوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو تعلیم دیں اور ان کے خلاف جو بھی کہا گیا ہے اس کا مقابلہ کریں۔ آپ کو دفاتر قائم کرنے ہیں۔ آپ کو تنظیمی معاملات پر توجہ دینی ہوگی، کیونکہ کوئی بھی پارٹی تنظیم کے بغیر نہیں چلائی جا سکتی۔

www.bhutto.org

بلاشبہ، پارٹی کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے آپ کو پارٹی کے اصولوں کا پابند بنائیں۔ ان پر غور و خوض کریں۔ یہ نہ سمجھئے کہ آپ باآسانی اپنے حقوق حاصل کر لیں گے۔ آپ کو ان کیلئے لڑنا پڑے گا۔

لوگوں کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ گھر میں بت بنے بیٹھے رہنے سے وہ اپنے حقوق حاصل کر لیں گے۔ آپ کو ایک طویل جدوجہد کا سفر طے کرنا ہے۔ یہ سب چیزیں آپ ایک جنبش میں حاصل نہیں کر سکتے، آپ کو کام کرنے کیلئے تیار رہنا چاہیے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ اگر چوکس و خبردار ہیں تو کوئی عوام مخالف سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایوب خان نے گول میز کانفرنس کے ذریعے ایک عوام مخالف سازش چلانے کی کوشش کی تھی۔ اس کا مطلب دائیں بازو کی پارٹیوں سے سودے بازی اور اشتعال کے فلسفہ کا دفاع کرنا تھا۔ وہ سب پارٹیاں جو ماضی میں ایوب خان کے خلاف ہوا کرتی تھیں، وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے گئیں۔ انہوں نے ایسا کیا، کیونکہ ان کے اقتصادی خیالات باہم تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جمہوریت چاہتی ہوں۔ لیکن وہ سب اقتصادی نظام کے بنیادی سوال پر متفق تھیں۔ انہوں نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ حالانکہ وہ پہلے شرکت کے خیال اور ایوب خان کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنے کی مخالفت کر چکی تھیں۔ جب انہوں نے اپنے مشترکہ خیالات کی طرف دیکھا تو انہیں خطرے میں پایا اور اس طرح وہ دوڑتے ہانپتے راولپنڈی پہنچ گئیں۔ بعد میں انہوں نے میرے خلاف پروپیگنڈہ کرنا شروع کیا اور کہنے لگیں کہ کانفرنس میرے عدم تعاون کے سبب کامیاب نہ ہو سکی، میں کیسے اس کانفرنس میں شرکت کر سکتا تھا جو عوام کی مفادات کے خلاف طلب کی گئی تھی؟ میں ایسے محاذ کی حمایت کیسے کر سکتا تھا، جو کہ عوام کے خلاف بنایا گیا تھا!؟ اگر میں اس میں شرکت کیلئے گیا ہوتا تو ملک میں جاری جدوجہد اپنے مایوس کن انجام تک پہنچ جاتی۔ ایوب خان کسی نہ کسی طرح عوامی جدوجہد کو سبوتاژ کرنا چاہتا تھا، لیکن کوئی بھی عوام مخالف سازش یہاں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ عارضی طور پر کامیاب ہو سکتی ہے۔ لیکن یقیناً اسے بالآخر شکست ملتی ہے۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ اگر یہاں کوئی بھی عوام مخالف محاذ کھڑا کیا جاتا ہے، تو ہم اس کے خلاف لڑیں گے اور اس کے دانت اور ناخن گہرا گڑھا کھود کر دفن کر دیں گے۔

۷- جولائی ۱۹۷۰ء

اورنگی میں پی پی پی کی آفس کے افتتاح کے موقع پر خطاب

www.bhutto.org

انقلابی پارٹی کی تشکیل

کل آپ نے ایک عظیم الشان اور کامیاب جلسہ منعقد کیا۔ میں آپ کا اور پارٹی کارکنوں کا شکر گزار ہوں، جن کی کوششوں کے بغیر یہ جلسہ منعقد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم اپنی پارٹی میں نظم وضبط کو اولین ترجیح دینے کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ جب پاکستان پیپلز پارٹی وجود میں آئی تو اس نے عوام کو ایک منشور دیا۔ یہ منشور اس وقت دیا گیا، جب انتخابات کا کوئی سوال موجود نہیں تھا۔ ہم اسی منشور کی پیروی کر رہے ہیں اور اس کے نفاذ کیلئے کام کرتے رہیں گے۔ ہمیں ایک مضبوط تنظیم کی ضرورت ہے۔ کسی پارٹی کو آغاز میں منظم کرنا مشکل کام ہوتا ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ یہ بنیادی کام آہستہ آہستہ کیا گیا ہے اور اب ہماری تنظیم نے اچھی طرح اپنے پاؤں جما لیے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں اس شہر اس وقت بھی آیا تھا، جب پارٹی ابھی نہیں بنائی گئی تھی۔ اس باغ میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس وقت میرا ایک دوست میرے پاس آیا اور اس نے کہا تھا کہ آپ پارٹی بنائیں۔ میں نے یہ فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا، لیکن اس کا اعلان نہیں کیا تھا۔ اس وقت پریس کے نمائندوں اور دیگر احباب نے پوچھا کہ آپ کے مستقبل میں پلان کون سے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ میں ایسی پارٹی بنانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو کہ انقلابی پارٹی ہو، ایک ترقی پسند اور عوام کی پارٹی ہو اور جو وقت کے ضروریات کے ساتھ کام کرے۔ اس کا اولین مقصد اقتصادی نظام میں تبدیلی لانا ہوگا، کیونکہ یہی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مجھے یہ کہا گیا تھا کہ پاکستان میں ایسی پارٹی کا قیام ممکن نہیں ہے۔

میرے دوستوں نے مجھے کہا تھا کہ پاکستان میں پہلے ہی بہت ساری پارٹیاں موجود ہیں، لہٰذا مزید پارٹی کی ضرورت نہیں ہے۔ شاید اس وقت سات یا آٹھ پارٹیاں موجود تھیں۔ بعد میں کچھ اور پارٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مجھے یہ بھی کہا تھا کہ وقت کی ڈکٹیٹرشپ اور ڈکٹیٹر ہماری راہ میں کانٹے بچھائے گا اور ہمارے لئے چلنا محال ہو جائے گا۔

میں انہیں بتاتا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ میں ایک بہت مشکل کام کرنے جا رہا ہوں، لیکن میرا ایمان ہے کہ جدوجہد اور قربانی کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں کی جا سکتی۔ پچھلی دو دہائیوں سے ملک میں کوئی خاص سیاسی سرگرمی نہیں کی گئی ہے۔ کچھ سیاستدانوں نے فوجی افسران کی مدد سے ملک پر

www.bhutto.org

حکومت کی ہے۔ اگر چہ ایک انقلابی پارٹی بنانا ایک اوچا پہاڑ سر کرنے کے مترادف تھا، لیکن ہم تہیہ کیے ہوئے تھے کہ ہم سب مشکلاتوں کا مقابلہ کریں گے۔ سبھی پارٹیوں کے لوگ اس جلسہ میں شریک ہوئے ہیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہماری دعوت قبول کی اور اس موقعہ کو ہاتھ سے نہیں گنوایا۔ شاید اپنی پارٹی کے بارے میں بات کرنا انہیں پسند نہ ہو۔ پیپلز پارٹی کو ابھی بہت سارا تعمیری کام کرنا ہے۔ اس کے پاس ایک منشور ہے۔ اس کے پاس ایک فلسفہ ہے۔ وہ طے شدہ اصولوں پر عمل پیرا ہے۔ ہمیں دیگر پارٹیوں کے خلاف غلط پروپیگنڈہ اور غلط تقاریر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں بس اپنا کام کرنا ہے۔ میں یہاں ایک سیاسی تقریر کرنے نہیں آیا۔ ہمیں ان سبھی دیگر پارٹیوں کی بزرگ شخصیات کا احترام ہے، جو یہاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ دوسروں سے صبر و اخلاص سے پیش آئیں۔ قیام پاکستان کے بعد لوگ اختلاف رائے کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ حکومتیں اپنے مخالفین کو جیل میں ڈال دیا کرتی تھیں۔ اس عمل سے کوئی سیاسی فائدہ نہ ہوا۔ سیاسی معاملات لوگوں کے پاس جا کر سیاسی طریق کار سے حل ہونے چاہئیں کیونکہ عوام کا فیصلہ حتمی ہوتا ہے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ ۲۳ برسوں میں دو آئین نافذ کیے جا چکے ہیں۔ بھارت نے بھی ہمارے ساتھ آزادی حاصل کی تھی۔ اس نے آئین تشکیل دیا، جس میں غلطیاں ہو سکتی ہیں، لیکن وہ آج تک کام کر رہا ہے۔ دوسری طرف پاکستان میں دونوں آئین ناکام ہوئے، کیونکہ آئین وضع کرنے کے وقت عوام کی رائے معلوم نہیں کی گئی تھی۔ عوام کے حتمی فیصلے کے بغیر کوئی بھی بنیادی سوال مستقل حل نہیں کیا جا سکتا۔ ہم مزدوروں اور دیگر جماعتوں کے لیڈران کو خوش آمدید کہتے ہیں جو آ کر اس استقبالیہ میں شریک ہوئے ہیں۔ ہم کل ایک پبلک میٹنگ منعقد کر رہے ہیں۔ ہمارے قلات کے دوست اور مقامی کارکن تقریریں کریں گے۔ ہم مختلف معاملات پر پارٹی موقف بیان کریں گے۔ یہ میٹنگ ایک سیاسی میٹنگ ہوگی۔ آخر میں، میں آپ کی اجازت سے ایک سیاسی بات کرنا چاہوں گا۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کا بلوچستان میں وجود نہیں ہے۔ کل آپ دیکھیں گے کہ پاکستان پیپلز پارٹی یہاں پر بھی اکثریت سے موجود ہے۔ میں ان دوستوں اور بھائیوں کا شکر گزار ہوں جو کہ باہر کھڑے ہیں۔ میں معذرت کرتا ہوں کیونکہ پولیس کو دوبارہ اپنی ڈیوٹی پر آنے کی زحمت اٹھانا پڑی تھی۔

۱۳- جون ۱۹۷۰ء

کوئٹہ میں استقبالیہ کو خطاب۔

www.bhutto.org

آیئے عوام سے مشورہ کریں

دلیل دی جا رہی ہے کہ آدمی کو انتہائی پالیسیوں کو درگزر کرنا چاہیے، تاکہ متوازن پالیسیوں کی نشوونما ہو سکے اور انہیں حاصل کیا جا سکے۔ میں حیران ہوں کہ کوئی شخص کس طرح انتہائی بدعنوانی چور بازاری اور غربت کے مسائل کو متوازن پالیسیوں کی بناء پر حل کر سکتا ہے!

یہ حقیقت ہے کہ ہمیں ایک ایسی جدید پارٹی کی ضرورت ہے، جو قائداعظم کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کر سکے۔ ایک متوازن پالیسی کی بات کرنا محض ایک فریب ہے۔ ایک ایسے ملک کو متوازن پالیسیوں پر چلا نہیں سکتے جہاں پر سبھی اقسام کی برائیاں اپنی بگڑی ہوئی شکل میں موجود ہوں۔

میں کسی متوازن پالیسی پر کام نہیں کروں گا۔ میرے پاس ایک انقلابی پالیسی ہے۔ جسے اندرون خواہ بیرون ملک ہمارے دشمنوں کے خلاف چلایا جائے گا۔ ہم قربانیاں دینے سے نہیں گھبراتے۔ ہم جیلوں میں جانے سے نہیں ڈرتے۔ ہم پاکستان کیلئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کو ہمیشہ تیار رہیں گے۔ موجودہ نظام حکومت میں یہ انتخابات ہمارے لئے آخری ثابت ہوں گے۔

نوابزادہ شیر علی خان اس سال کی شروعات میں ایک انٹرویو میں کہہ چکے ہیں کہ اگر یہ انتخابات صاف اور شفاف انداز میں برپا نہیں کئے جا سکے اور اگر آئین تشکیل نہیں دیا جا سکا تو انتخابات دوبارہ تین ماہ بعد کرائے جائیں گے اور اگر یہ انتخابات بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئے تو تین ماہ بعد انتخابات کے مزید ایک مرحلے کا اہتمام کیا جائے گا۔ میں یہ کہوں گا کہ نوابزادہ صاحب ہم ایسے عملی مذاق میں فریق نہیں ہوں گے۔ عام انتخابات ۲۳ سالوں میں نہیں ہو سکے ہیں آپ کیسے ہر تین ماہ بعد انتخابات کرا سکیں گے؟

تین ماہ کے اندر انتخابی حلقوں کے حوالے سے کس ڈیڈ لاک کی صورت میں پارٹیوں کی پوزیشن پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑے گا۔ لہٰذا کون سی اچھائی آپ تازہ انتخابات سے پا سکیں گے؟ ہم

www.bhutto.org

آئندہ انتخابات کو حتمی تصور کریں گے۔ ہم ایک آئین بنائیں گے، ایک پاکستانی، اسلامی اور مقبول عام آئین۔ اگر ہم ہار جاتے ہیں تو یہ شکست سب کی شکست ہوگی۔ ہم انتخابات بار بار نہیں لڑ سکتے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انتخابات مسائل حل نہیں کرتے۔

یہ پیپلز پارٹی ہی ہے جس نے سیاسی سرگرمیوں سے پابندی اٹھ جانے کے بعد بڑی تعداد میں عام جلسہ منعقد کئے ہیں۔ اس لئے کہ پارٹی آپ سے، عوام سے رابطہ میں رہنا چاہتی ہے۔ یہ آپ کی پارٹی ہے، کیونکہ آپ نے ہی اسے بنایا اور مقبول عام کیا ہے۔ یہ محض انتخابات کا سوال نہیں ہے۔ ہم ووٹ مانگنے کیلئے آگے نہیں آئے ہیں۔ ہم تو ایوب خان کی ڈکٹیٹرشپ کے زمانے سے تقاریر کرتے آئے ہیں۔ اگر کوئی چاہے تو پوچھ سکتا ہے کہ اس وقت ہمارے یہ عظیم نام نہاد سیاستدان کہاں پر تھے؟ پاکستان پیپلز پارٹی ہمارے لئے اس مقصد کے ساتھ نہیں بنائی گئی تھی کہ یہ صرف انتخابات کے موقع پر باہر آئے۔

مانتے ہیں کہ انتخابات بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر پہلی مرتبہ ملکی سطح پر برپا کئے جا رہے ہیں۔ لیکن صوبائی انتخابات ہو چکے ہیں۔ بھارت اب تک تین انتخابات کرا چکا ہے۔ تو کیا وہاں بدحالی اور غربت کا خاتمہ ہو چکا ہے؟ صورت حال خراب تر سے خراب ترین ہونے کی جانب گامزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انتخابات کو کبھی بیماریوں کا علاج نہیں سمجھتے۔ ہماری پارٹی ایک انقلابی پارٹی ہے جو عام آدمی کیلئے جدوجہد کرنے اور اس کی خدمت کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ یہ دشمن کے خلاف لڑنے کی ترجمان ہے۔ اس نے عزم کر رکھا ہے کہ کشمیر کو پاکستان میں شامل ہونے کا حق دلانے کیلئے آخری پل تک جدوجہد جاری رکھی جائے گی۔

میں نے آپ کی رائے دریافت کی ہے کہ ہمیں انتخابات لڑنے چاہئیں یا نہیں۔ میں جنوری سے لے کر جولائی تک آپ سے پوچھتا آیا ہوں۔ ہمارے مخالفین نے اس لئے کہا کہ پیپلز پارٹی انتخابات نہیں لڑے گی کیونکہ وہ تشدد اور انتشار میں یقین رکھتی ہے اور یہ بھی کہ یہ کامیابی کیلئے پرامید نہیں ہے۔

یہ ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کا ایک رخ ہے۔ دوسری جانب یہاں پہلی مرتبہ بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخابات منعقد کرائے جا رہے ہیں۔ ہم نے عام جلسے منعقد کرنے کیلئے آپ کی

www.bhutto.org

رائے پوچھی، آپ نے ہمارے انتخابات میں حصہ لینے کے حق میں فیصلہ دیا۔ لہٰذا ہالا کانفرنس کے موقع پر ہم نے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے گول میز کانفرنس میں شرکت کے معاملہ پر بھی آپ سے رائے معلوم کی تھی۔ میں اس کانفرنس میں شریک ہونے کے خلاف تھا، کیونکہ میں نے سمجھا کہ یہ عوام کے خلاف ایک سازش تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ آمریت کے ہاتھوں کو مزید مضبوط کرنے کی طرف لے جائے گی۔ تاہم میں نے خود کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ میں آپ کے پاس آیا تو آپ نے اس میں شرکت کرنے کی اجازت نہ دی اور میں نے ایسا ہی کیا۔ ہالا کانفرنس کے موقع پر انتخابات میں حصہ لینے کے معاملہ پر دو آپشنز تھے۔ ایک خیال حصہ لینے کے خلاف تھا اور اس ضمن میں مشورہ یہ دیا گیا تھا کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو یہ عمل عوام کو دھوکہ دینا ہوگا۔ دلیل یہ تھی کہ عوام یہ سمجھے گا کہ ان کی مسائل فوراً حل ہو جائیں گے۔ اور جب وہ جان جائیں گے کہ ان کے مسائل انتخابات کے بعد بھی حل نہیں ہوئے تو وہ یہ سمجھیں گے کہ انہیں دھوکہ دیا گیا ہے۔

دوسرا نقطہ یہ تھا کہ عوام چاہتے ہیں کہ انتخابات منعقد کئے جائیں۔ لہٰذا ہمیں آغاز سے ہی واضح کر دینا چاہیے کہ انتخابات تن تنہا عوامی مسائل حل نہیں کر سکتے۔ فی الحال ہمیں مخالفین کو شکست دینے کیلئے انتخابات میں شریک ہونا چاہیے۔ یہ دلیل بھی پیش کی گئی کہ اسمبلی ہمیں ایک اضافی پلیٹ فارم مہیا کرے گی، لہٰذا آپ کی رائے کے مدنظر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم انتخابات میں حصہ لیں گے۔

میں پر اعتماد ہوں کہ ہم آئین ساز اسمبلی میں کامیاب ہو کر پہنچیں گے اور انشاء اللہ اکثریت سے سامنے آئیں گے۔ ہمیں کوئی روک نہیں سکتا۔ ہمارے دشمن، سامراجیوں کے پٹھو اور سرمایہ دار کہتے رہے ہیں کہ ہم سب کی مشترکہ کوئی پارٹی نہیں ہے، یہ ایک آدمی کی پارٹی ہے۔ یہ ایک باطل پروپیگنڈہ ہے۔ انہوں نے وہ کیا، جو کچھ ہمارے خلاف کر سکتے تھے۔ لیکن عوام ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ بھی کیا گیا تھا کہ لوگ بھٹو کو محض دیکھنے آتے ہیں۔ میں کوئی فلمی ہیرو نہیں ہوں، جسے لوگ دیکھنے آتے ہوں، لوگ مجھے سننے کیلئے آتے ہیں کیونکہ میں ان کے مسائل اور محسوسات کو واضح کرتا ہوں اور حل بتاتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہماری پارٹی سے عقیدت رکھتے ہیں۔ وہ وقت آ رہا ہے جب آپ دیکھیں گے کہ ہم نے کس سطح کی کامیابی حاصل کی ہے۔ کچھ سرکاری وزراء ہمارے لئے پریس کے ذریعے اور پیسہ خرچ کر کے بہت ساری مشکلاتیں پیدا کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے

www.bhutto.org

باوجود پیپلز پارٹی کامیاب ہو کر ظاہر ہوگی۔ اگرچہ ہمارے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے، پھر بھی ہم پر الزام لگائے جارہے ہیں کہ ہم عام جلسوں پر بھاری مقدار میں رقوم خرچ کررہے ہیں۔ ہاں تھوڑا بہت خرچ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں دوست احباب تعاون کرتے ہیں۔ میں اس طرح پیسہ خرچ کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں نے کبھی بھی عوام سے چندہ کی اپیل نہیں کی ہے۔ میں ان سے مانگتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہوں، اس لئے میں نے آپ سے کہا ہے کہ جو کچھ اپنے طور پر کم از کم کرسکتے ہیں، کریں۔ خواہ وہ ایک روپیہ دو روپے یا آٹھ آنے ہی کیوں نہ ہوں۔

آپ سب خاطری کرسکتے ہیں کہ پیپلز پارٹی حقیقتاً اور وفاداری سے آپ کی نمائندگی کرے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پارٹی میں سے کسی نے بھی آپ کی خواہشات کے خلاف کچھ کیا تو میں اسے پارٹی سے نکال دوں گا۔ عوام مجھے زیادہ عزیز ہیں۔ میں عوام سے غداری کرنے والے کسی شخص کو برداشت نہیں کرسکتا۔ میں اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بناؤں گا، جیسا کہ یحییٰ خان کررہا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ جب کبھی بھی ہم یحییٰ خان سے کہتے ہیں کہ وہ ان خاص وزراء کو فارغ کرے تو وہ اس کو اپنی ذاتی انا کا مسئلہ بنالیتا ہے۔ یہ رویہ سامراجیوں جیسا ہے۔

ہم نے یحییٰ کو بتایا تھا کہ انتقابی مہم کے دوران اس کے وزراء غیر جانبدار نہیں رہیں گے۔ اس نے کہا کہ میں غیر جانبدار رہوں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ سیاست میں دخل اندازی کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو ایک خاص جماعت کیلئے سرمایہ داروں سے مدد مانگتا پھر رہا ہے۔ انہی وزراء نے عوام دشمن بجٹ بنایا ہے۔ ایک جانب تو ٦-نکات کو پاکستان مخالف قرار دیا گیا ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں، کیونکہ وہ پاکستان کی یک جہتی کو خطرہ میں ڈال رہے ہیں، لیکن دوسری طرف ایک اخبار، جو کہ کراچی کے وزراء میں سے ایک سے تعلق رکھتا ہے، مسلسل انہی ٦-نکات کا کھیل کھیل رہا ہے۔

اب بجٹ کی طرف آتے ہیں۔ ہم نے پچھلے ٢٣ سالوں سے اتنا بیکار بجٹ کبھی بھی نہیں دیکھا، جس میں عوام پر بھاری وزن ڈال دیا گیا ہو۔ تقریباً ہر ایک چیز کی قیمت میں ٢٥ فیصد اضافہ کیا گیا ہے۔ اس بجٹ نے عوام کو روند کر رکھ دیا ہے۔ وہ لوگ جو مقررہ ماہانہ تنخواہ اٹھاتے ہیں، پہلے ہی بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں، وہ کیسے محصولات ادا کریں گے۔ پناہ گیر ٹیکس کے تحت کروڑوں روپے چار

www.bhutto.org

ج کیے گئے ہیں، آخر وہ پیسہ کہاں گیا؟ پہلے ملیر (Malir) میں چوتھائی (Quarter) ۷۰۰ روپوں میں پڑتی تھی اب ۱۴۰۰ روپوں میں پڑتی ہے۔ اس حساب میں سود بھی اینٹھا جاتا ہے۔ اور آمدورفت کا مسئلہ ہے۔ بچے اسکول کس طرح جائیں گے۔ یہ مسائل ملک میں اقتصادی تبدیلیاں لانے کے بعد حل کیے جاسکتے ہیں۔ ہم میٹرک تک مفت تعلیم دینا چاہتے ہیں۔

محنت کشوں کے مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ مختلف کارخانوں میں مزدوروں کے ساتھ کیسا سخت رویہ رکھا جاتا ہے۔ مزدوروں کو بند کیا گیا ہے، ستایا گیا ہے، انہیں جیلوں میں ڈالا گیا ہے۔ غریب آدمی کرے تو کیا؟ قیمتیں مستقلاً بڑھ رہی ہیں۔ کارخانے بند ہیں۔ لوگ کیسے جی سکتے ہیں۔ ایسی زندگی سے موت بہتر لگتی ہے، لیکن ہم اسلامی مساوات کا ایسا نظام پیش کریں گے جو کہ تشدد اور استحصال کا خاتمہ کرے گا اور ایک عوامی قبولیت رکھنے والی حکومت قائم کرے گا۔ ہمارے مطالبے عوام کے مطالبے ہیں۔ غربت اور مفلسی اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک ملک کے اقتصادی نظام میں انقلابی تبدیلیاں نہیں لائی جاتیں۔ بڑے صنعتی یونٹوں کو نیشنلائیز کیے بغیر غربت، مفلسی اور ناخواندگی کا خاتمہ نہیں لایا جاسکتا۔ جب تک اسلامی مساوات کا نفاذ نہیں ہوتا تب تک پاکستان خوشحال نہیں ہوسکتا۔ میں وہ اکیلا آدمی نہیں جو کہ اسلامی سوشلزم کی حمایت کر رہا ہے۔ بانی پاکستان قائداعظم نے اسلامی سوشلزم کی تائید کی تھی۔ لیاقت علی خان اور حسین شہید سہروردی دونوں نے اس کی وکالت کی تھی۔ ہم اسلامی سوشلزم کے پہلے پیروکار نہیں ہیں۔ جب تک ہم معاشرہ کے ڈھانچہ میں بنیادی قسم کی تبدیلیاں نہیں لاتے، اس وقت تک ہم اس ابھرتی ہوئی صورت حال پر قابو نہیں پاسکتے۔ جب تک یہ نہیں کرتے اور دولت اور آمدن میں کسی زیادہ برابر تقسیم کی یقین دہانی نہیں کرالیتے تب تک مشرقی پاکستان میں ۶-نکات کے بارے میں بات چلتی رہے گی اور مغربی پاکستان میں کنفیڈریشن کی صدائیں گونجتی رہیں گی۔ ایسی چیزیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کوئی ملک بیچارگی اور ناکامی میں مبتلا ہوتا ہے۔ آخر امریکہ، سوویت روس اور چین کنفیڈریشن کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے؟ وہ جماعتیں جو کنفیڈریشن کا تضاد پیدا کرنے میں ملوث ہیں، ہم سے براہ راست بات کیوں نہیں کرتیں؟ کیا لاکھوں مسلمانوں نے قربانیاں اس لئے دی تھیں کہ اپنی آزادی اور خودمختیاری دوسروں کے ہاتھوں میں دے دیں؟ یہ سب نفسیاتی تھکن کا نتیجہ

www.bhutto.org

ہے۔ پاکستان کو ۶- نکات یا کنفیڈریشن کے تضادات کے سپرد کرنے کیلئے نہیں بنایا گیا تھا۔ قیام پاکستان اس لئے عمل میں نہیں لایا گیا تھا کہ ہمارے اوپر ایسے لوگ مسلط کئے جائیں، جنہوں نے واشنگٹن میں قائداعظم کے خلاف بات کی ہے۔ تصور پاکستان طلباء اور مزدوروں کی گرفتاریوں کا احاطہ نہیں کرتا۔

کشمیر میں مسلمانوں اور نوجوان طلباء کو ستایا جارہا ہے۔ صورت حال اتنی سنگین ہوگئی ہے کہ سزاندرا گاندھی کو بذات خود سرینگر جانا پڑا۔ وہ وہاں یہ کہنے کے لئے گئیں کہ کسی بھی صورت میں بھارت پاکستان کے ساتھ مذاکرات کرنے کیلئے تیار نہ ہوگا۔ اس کے باوجود ہماری طرف سے کچھ بھی کہا یا کیا نہیں جارہا ہے۔ سب رہنما خاموش ہیں۔ جب برطانیہ نے جنوبی افریقہ کو ہتھیار بیچنے کا فیصلہ سنایا تھا تو سلامتی کونسل نے ایک میٹنگ طلب کی تھی۔ ممالک افریقی دولت مشترکہ نے کامن ویلتھ چھوڑنے کی دھمکی دی تھی۔ لیکن جب مسلمان کشمیر میں گرفتار کئے جارہے ہیں اور قتل ہورہے ہیں، پاکستان یہ نہیں کہتا کہ یہ مسئلہ وہ سلامتی کونسل میں اٹھائے گا۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے کہ ہم یہاں انتخابات کی بات کررہے ہیں جبکہ بمبئی، احمد آباد اور کشمیر میں مسلمانوں کو بیدردی سے قتل کیا جارہا ہے۔ میں کشمیری مسلمانوں کو سلام پیش کرتا ہوں جو کہ بھارتی بندوقوں اور سنگینوں کا مقابلہ کررہے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو زبان خرچ تک محدود کیا ہوا ہے، یہ مسئلہ سلامتی کونسل میں اٹھایا جانا چاہیے۔ ہم کشمیر کے مسئلے پر سودے بازی نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ اس مسئلے پر سودے بازی پاکستان کے وجود کو کاٹ کر رکھ دے گی۔ ایوب خان نے جنگ ۱۹۶۵ء کے بعد اس مسئلے کو پس منظر میں لے جانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن صورت حال نے اب ایک سنجیدہ موڑ لے لیا ہے۔ اگر حکومت کچھ اور نہیں کرسکتی تو کم از کم فوری طور پر اس مسئلے کو سلامتی کونسل میں لے جائے۔

۱۵ اگست ۱۹۷۰ء

ملیر میں عام جلسہ سے خطاب

www.bhutto.org

بھٹو کی شخصیت ایک فکر بن چکی ہے، اب ان کا فیصلہ ان
کے حاسد اور متعصب ہم عصر نہیں بلکہ تاریخ کرے گی

www.bhutto.org